ماہنامہ

# اشراق

لاہور

اپریل ۲۰۱۶ء

زیر سرپرستی

## جاوید احمد غامدی

''نظم قرآن کے خفا کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ علما نے قرآن کے لفظ لفظ سے مسائل اخذ کیے ہیں۔ اس شوق میں کہ منطقی طور پر جو کچھ اس سے مستنبط ہو، منصوص سمجھا جائے۔ سیاق وسباق کی طرف کچھ لحاظ نہ کیا اور جس طرح امام بخاری نے ایک حدیث کو متعدد ابواب میں ذکر کر کے اس سے چند در چند مسائل مستنبط کیے ہیں۔ مفسرین نے ایک ایک آیت کو مضامین متنوعہ کا منبع قرار دیا۔ پھر یہ کیونکر پتا لگے کہ یہ آیت کس امر کو اصلی طور پر اور کس امر کو ضمناً بیان کرتی ہے اور لامحالہ اس کشاکش مضامین میں سر رشتۂ نظم ہاتھ سے جاتا رہا۔''

—— مقالات

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

المورد

# فہرست

**اس شمارے میں**
اس شمارے میں | نعیم احمد | ۴

**قرآنیات**
البیان: النحل ۱۶: ۳۳-۴۷ (۳) | جاوید احمد غامدی | ۵

**معارف نبوی**
متوفیٰ کے روزوں کا کفارہ | معز امجد / شاہد رضا | ۹

**سیر و سوانح**
حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ (۲) | محمد وسیم اختر مفتی | ۱۱

**مقالات**
ترتیب و نظام قرآن | مولانا حمید الدین فراہی | ۲۱
مسلمان نوجوانوں کے فرائض | مولانا امین احسن اصلاحی | ۲۶

**نقطۂ نظر**
دولت اسلامیہ اور قیام خلافت: ایک سنگین مغالطہ | محمد عمار خان ناصر | ۳۷
سیکولرزم اور مذہب کی بحث | خورشید احمد ندیم | ۴۲

**یسئلون**
اسلامی ریاست میں عہدے کی طلب | مولانا امین احسن اصلاحی | ۴۶

**ادبیات**
غزل | جاوید احمد غامدی | ۴۹

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نعیم احمد

''قرآنیات'' میں جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا ترجمۂ قرآن ''البیان'' شائع کیا گیا ہے۔ یہ قسط سورۂ نحل کی آیات ۳۳-۴۷ کے ترجمہ اور حواشی پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں مشرکین کی کج بحثیوں کا ذکر ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم کو صبر کے ساتھ اللہ پر بھروسا قائم رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ انھیں اطمینان دلایا گیا ہے کہ آزمایشوں کے دور سے گزرنے کے بعد بالآخر فتح و کامیابی انھی کا حصہ ہے۔

''معارف نبوی'' میں شاہد رضا صاحب کے مضمون میں مرحوم کے ذمے رہ جانے والے روزوں کے کفارہ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ معز امجد صاحب کے ایک انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ ہے۔

''سیر و سوانح'' کے تحت محمد وسیم اختر مفتی صاحب کے مضمون کے دوسرے حصے میں جلیل القدر صحابی حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے غزوات میں حصہ لینے کا ذکر کیا گیا ہے۔

''مقالات'' میں امام حمید الدین فراہی صاحب نے اپنے مضمون میں قرآن کے نظم و ترتیب کو جامع لفظوں میں بیان کیا ہے۔ اسی کے تحت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی ایک تقریر ''مسلمان نوجوانوں کے فرائض'' شائع کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے نوجوانوں میں تعمیری جذبہ کو بیدار کرتے ہوئے نئی دنیا کی دریافت پر ابھارا ہے۔

''نقطۂ نظر'' میں محمد عمار خان ناصر صاحب نے اپنے مضمون میں دولت اسلامیہ کے اس مغالطے کو بیان کیا ہے کہ ان کا سربراہ شرعی لحاظ سے سارے عالم اسلام کے ''خلیفہ'' کی حیثیت رکھتا ہے جس کی اطاعت تمام مسلم اقوام پر لازم ہے۔ اسی کے تحت خورشید احمد ندیم صاحب نے اپنے مضمون ''سیکولرزم اور مذہب کی بحث'' میں ان دو اصطلاحوں کے فرق کو واضح کیا ہے۔

''یسئلون'' میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اسلامی ریاست میں عہدے کی طلب کے ایک سوال کے جواب میں بیان کیا ہے کہ اسلام میں مناصب اور عہدوں کی طلب و تمنا طمع کے سبب ناپسند ہے، جبکہ اہل لوگوں کا ذمہ داریوں سے گریز بھی ایک ناپسندیدہ بات ہے۔

''ادبیات'' میں جاوید احمد غامدی صاحب کی ایک غزل شائع کی گئی ہے۔

---

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# سورة النحل

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَاَصَابَهُمْ
سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾
وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ
اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ

---

کیا یہ اِسی کے منتظر ہیں کہ اِن کے پاس فرشتے آئیں یا تیرے پروردگار کا فیصلہ صادر ہو جائے؟ اِن سے پہلے والوں نے بھی یہی کیا تھا۔ (پھر جو کچھ ہوا، وہ) اللہ نے اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ وہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔ سو اُن کے کرتوتوں کی سزائیں اُن کو ملیں اور جس چیز کا مذاق اڑا رہے تھے، اُسی نے اُن کو گھیر لیا۔ ۳۳-۳۴

یہ مشرکین کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اُس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کرتے، نہ ہم نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ اُس (کی ہدایت) کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھیراتے۔ اِن سے پہلے والوں نے بھی یہی

عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ
فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۶﴾
اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۷﴾
وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ
حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ
لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾

---

رویہ اختیار کیا تھا۔ سو رسولوں پر تو صاف صاف پہنچا دینے ہی کی ذمہ داری ہے۔ (وہ اپنے کسی تصرف سے لوگوں کو حق کی راہ پر نہیں لگاتے اور نہ خدا یہ کرتا ہے۔ چنانچہ دیکھ سکتے ہو کہ) ہم نے ہر قوم میں ایک رسول اِس دعوت کے ساتھ بھیجا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو اور شیطان سے بچو تو اُن میں سے کچھ کو اللہ نے ہدایت بخشی اور اُن میں کچھ ایسے بھی ہوئے جن پر گمراہی مسلط ہو گئی۔ سو زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا ہے۔ ۳۵-۳۶

تم اِن کی ہدایت کے حریص ہو (تو اِس سے کیا حاصل کر لو گے، اے پیغمبر)، اِس لیے کہ اللہ اُن کو ہدایت نہیں دیتا جنھیں وہ (اپنے قانون کے مطابق) گمراہ کر دیتا ہے اور اُن کا کوئی مددگار بھی نہیں بن سکتا۔ ۳۷

یہ اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے، اللہ اُس کو نہیں اٹھائے گا۔ کیوں نہیں، یہ اُس پر ایک وعدہ ہے جسے وہ لازماً پورا کرے گا، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ یہ اِس لیے ہوگا کہ اللہ اِن کے سامنے اُس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں اور منکرین جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔ (یہ ہمارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے)۔ ہم جب کسی چیز کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اُس کے بارے میں ہمارا اتنا ہی کہنا ہوتا ہے کہ ہم اُس کو کہتے ہیں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔[۲۲] ۳۸-۴۰



www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ
الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾
وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ

(ہم کیوں نہیں اٹھائیں گے)؟ جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی ہے، اِس کے بعد کہ اُن پر ظلم ڈھائے گئے، ہم اُن کو دنیا میں بھی لازماً اچھا ٹھکانا دیں گے[۲۳] اور آخرت کا اجر تو کہیں بڑھ کر ہے[۲۴]۔ اے کاش، یہ منکرین جانتے۔ اُنھی (ہجرت کرنے والوں) کو جو ثابت قدم رہے اور جو اپنے پروردگار ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔ ۴۱-۴۲

(اِنھیں اصرار ہے کہ اِن پر فرشتے اتارے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ) تم سے پہلے بھی ہم نے آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا، جن کی طرف ہم وحی کرتے رہے۔ سو اگر تم لوگ نہیں جانتے تو اُن

۲۲ یعنی اُس طریقے کے مطابق ہو جاتی ہے جو اُس کے لیے طے کر دیا جاتا ہے۔

۲۳ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے دنیا میں بھی غلبہ و اقتدار لازمی تھا۔

۲۴ آخرت کے بارے میں جو بات اوپر فرمائی ہے، یہ اُسی کو مطابق حال کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت نہیں ہو گی تو کیا یہ سمجھتے ہو کہ اللہ اُن لوگوں کو جو اُس کی راہ میں ستائے گئے ہیں، اُن کی جان بازیوں کا صلہ نہیں دے گا اور تمھاری جفاکاریوں پر تم سے کوئی باز پرس نہ کرے گا؟ یہ کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ اِس سے ہجرت کی حقیقت بھی واضح ہوئی کہ ہر نقل مکان ہجرت نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...ہجرت یہ ہے کہ آدمی اپنے دین کے معاملے میں ستایا جائے، یہاں تک کہ وہ اپنا محبوب وطن اور اپنا عزیز آشیانہ چھوڑ کر وہاں سے نکلنے اور دوسری سرزمین کو اپنی پناہ گاہ بنانے پر مجبور ہو جائے۔ اِس راہ میں صبر کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ اُس کے سر پر آرے ہی کیوں نہ چل جائیں، لیکن دین حق کی جو نعمت اُس کو مل چکی ہے، وہ اُس سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہ ہو اور 'توکل' کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ حالات کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں، لیکن وہ یہ اعتماد رکھے کہ اللہ اُس کو تنہا نہیں چھوڑے گا، بلکہ اُس کی دست گیری فرمائے گا۔ یہی صبر و توکل ہجرت کی راہ میں زادِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۴/ ۴۱۲)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۳﴾ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَ لَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۴۴﴾

اَفَاَمِنَ الَّذِیۡنَ مَکَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ یَّخۡسِفَ اللّٰہُ بِہِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ یَاۡتِیَہُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۴۵﴾ اَوۡ یَاۡخُذَہُمۡ فِیۡ تَقَلُّبِہِمۡ فَمَا ہُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ ﴿۴۶﴾ اَوۡ یَاۡخُذَہُمۡ عَلٰی تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّکُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۴۷﴾

---

سے پوچھ لو جو یاددہانی والے ہیں۔[۲۵] ہم نے اُن کو دلائل کے ساتھ اور کتابیں دے کر بھیجا تھا۔ اور اب یہ یاددہانی ہم نے تم پر اتاری ہے، اِس لیے کہ تم اِن لوگوں کے لیے اُس چیز کو بیان کر دو جو اِن کی طرف نازل کی گئی ہے اور اِس لیے کہ یہ غور کریں۔[۲۶] ۴۳-۴۴

پھر کیا یہ لوگ جو بری تدبیریں کر رہے ہیں، اِس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ اِن کو زمین میں دھنسا دے یا اِن پر وہاں سے عذاب آ جائے، جہاں سے اِنھیں گمان بھی نہ ہو یا اِن کو چلتے پھرتے پکڑ لے ــــ (وہ ایسا کرنے پر آ جائے) تو یہ اُس کو عاجز نہیں کر سکتے ــــ یا اِن کو ایسی حالت میں پکڑ لے کہ یہ (خود بھی اُس کا) اندیشہ محسوس کر رہے ہوں۔ (وہ اِنھیں مہلت دے رہا ہے)، اِس لیے کہ تمھارا پروردگار بڑا ہی نرم خو ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۴۵-۴۷

---

۲۵؎ یعنی اہل کتاب سے جو نبوت و رسالت کے باب میں خدا کے قانون کو خوب جانتے ہیں۔ اُنھیں معلوم ہے کہ انسانوں کے اندر نبوت و رسالت کا منصب ہمیشہ انسانوں ہی کو دیا گیا ہے، اِس کے لیے فرشتے کبھی منتخب نہیں کیے گئے۔

۲۶؎ یعنی اِس لیے اتاری ہے کہ بے کم و کاست اِن تک پہنچا دو اور یہ تدبر کے ساتھ اُس کا مطالعہ کریں تاکہ اُس کی روشنی میں اُن حقائق کو سمجھ سکیں جن کو سمجھانا خدا کے پیش نظر ہے۔ آیت میں ’لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں فعل ’تُبَیِّنَ‘ بالکل اُسی طرح آیا ہے، جس طرح سورۂ رحمٰن (۵۵) کی آیت ’اَلرَّحۡمٰنُ، عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ‘ میں لفظ ’عَلَّمَ‘ ہے۔ اِس سے شرح و وضاحت مراد نہیں ہے، جس طرح کہ ’عَلَّمَ‘ سے وہاں شرح و وضاحت کے ساتھ سکھانا، پڑھانا مراد نہیں ہے۔

[باقی]

---



www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معز امجد
ترجمہ و تدوین: شاہد رضا

# متوفیٰ کے روزوں کا کفارہ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَنْ مَاتَ وَعَلَیْہِ صِیَامُ شَھْرٍ فَلْیُطْعَمْ عَنْہُ مَکَانَ کُلِّ یَوْمٍ مِسْکِیْنٌ. (ابن ماجہ، رقم ۱۷۵۷)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص وفات پا جائے اور اس کے ذمے ایک ماہ کے روزے ہوں، تو اس کی جانب سے ہر روز (کے روزے) کے لیے ایک مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔

## وضاحت

علامہ محمد ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''ضعیف سنن ابن ماجہ'' (رقم ۱۷۵۷) میں اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔

## خلاصہ

اس روایت کی سند کے متعلق علامہ محمد ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ کی راے کے مطابق احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس روایت کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ گردانی جائے۔

## متون

اپنی اصل کے اعتبار سے یہ روایت ابن ماجہ، رقم ۱۷۵۷ میں روایت کی گئی ہے۔ اسی طرح کا مضمون ابن خزیمہ، رقم ۲۰۵۶-۲۰۵۷ میں بھی روایت کیا گیا ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد وسیم اختر مفتی

# حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ

(۲)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اواخر ۱۱ھ میں سیدنا ابوبکر نے حضرت خالد بن ولید کی قیادت میں تیرہ ہزار کا لشکر یمامہ روانہ کیا۔ مسیلمہ کذاب نے ان کی آمد کی خبر سن کر اپنے ایک لاکھ کے لشکر کو عقربا کے مقام پر ترتیب دیا۔ حضرت خالد نے مقدمہ پر حضرت خالد بن فلان مخزومی، میمنہ پر حضرت زید بن خطاب اور میسرہ پر حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ کو مقرر کیا۔ خود وہ حضرت شرحبیل کو لے کر آگے بڑھے۔ مسیلمہ کے لشکر تک پہنچنے میں ایک رات کا سفر تھا کہ ان کا گزر چالیس سے زیادہ سواروں پر مشتمل ایک دستے پر ہوا۔ مسیلمہ کے قبیلے بنوحنیفہ سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں نے بتایا کہ ہم بنوعامر سے اپنے مقتول کا بدلہ لینے آئے ہیں۔ حضرت خالد نے پوچھا: نبوت کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ انھوں نے کہا: ایک نبی ہمارا ہے اور ایک تمھارا۔ حضرت خالد نے انھیں تلوار کی دھار پر رکھ لیا، تمام قتل ہوئے۔ جب دو اشخاص ساریہ بن عامر اور مجاعہ بن مرارہ رہ گئے تو ساریہ نے کہا: اگر تم اس قریہ میں کوئی کارروائی کرنا چاہتے ہو تو مجاعہ کو زندہ رہنے دو۔ حضرت خالد نے اسے بیڑیاں پہنا کر اپنی اہلیہ حضرت ام تمیم کے سپرد کر دیا۔

جیش اسلامی عقربا پہنچا تو حضرت خالد بن ولید نے اپنی فوج کو بلند جگہ پر ٹھیرایا۔ مہاجرین کا علم حضرت سالم اور انصار کا حضرت ثابت بن قیس کے پاس تھا، دونوں نے اپنی فوج کو خوب گرمایا۔ جنگ شروع ہوئی تو نہار بن عنفوہ سب سے پہلے حضرت زید کے ہاتھوں جہنم رسید ہوا۔ اس مرحلے پر اسلامی فوج میں شامل بدو پسپا ہو گئے۔ بنوحنیفہ حضرت خالد کے خیمے میں داخل ہو کر ان کی اہلیہ حضرت ام تمیم کو قتل کرنے لگے تھے کہ مجاعہ نے ان کو بچایا۔ اب

حضرت خالد بن ولید، حضرت زید بن خطاب اور حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ نے فوج کو خوب جوش دلایا۔ حضرت زید نے کہا: واللہ، میں دشمن کو شکست سے دوچار کرنے تک کوئی کلام نہ کروں گا یا اللہ سے جا ملوں گا اور اسی سے اپنی معذوری بیان کروں گا۔ لوگو، اپنے دانت دبالو اور دشمن پر کاری وار کر ڈالو۔ سب نبیٔ کذاب کی فوج پر پل پڑے اور اسے پرے دھکیل دیا، اس حملے میں حضرت زید شہید ہوئے۔ حضرت ثابت بن قیس للکارے: مسلمانو، تم حزب اللہ ہو اور یہ حزب شیطان۔ عزت اللہ، اس کے رسول اور اس کے احزاب ہی کو حاصل ہو گی۔ جیسے میں دشمن پر حملہ کر رہا ہوں، تم بھی کر کے دکھاؤ۔ پھر شمشیر زنی کرتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ حضرت ابوحذیفہ پکارے: قرآن کے حاملو، قرآن کو اپنے کارناموں سے مزین کرو۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مسیلمہ کے لشکر پر زوردار حملہ کیا، صفوں کو چیرتے آگے بڑھ گئے اور جام شہادت نوش کیا۔ حضرت ابوحذیفہ کے آزاد کردہ حضرت سالم اور ان کے انصاری بھائی حضرت عباد بن بشر بھی اسی معرکہ میں شہید ہوئے، حضرت سالم نے آخری دم تک علم تھامے رکھا۔ حضرت خالد نے یہ صورت حال دیکھی تو ہر قبیلے کے فوجیوں کو یکجا ہو کر لڑنے کی ہدایت کی تاکہ معلوم ہو سکے کہ کون سا قبیلہ بزدلی دکھاتا ہے؟ انھوں نے جب مسیلمہ کو اپنی جگہ پر جمے دیکھا تو جان لیا کہ اسے قتل کیے بغیر فتح حاصل نہ ہو گی۔ وہ سیدھا اس کے پاس پہنچ گئے اور انا ابن الولید، انا ابن عامر وزید کہہ کر دعوت مبارزت دی۔ کئی سورما ان کے ہاتھوں قتل ہوئے، انھوں نے پھر مسیلمہ کو قبول حق کی دعوت دی، لیکن اس نے گردن ہلا کر انکار کیا۔ آخر کار جنگ کا بازار گرم ہوا اور مسیلمہ کی فوج شکست کھا کر ایک قلعہ نما باغ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی۔ اسلامی فوج نے باغ کا محاصرہ کر لیا، حضرت برا بن مالک کو ایک زرہ پر بٹھا کر نیزوں کی انیوں کے ذریعے بلند کر کے باغ کے اندر پھینکا گیا۔ انھوں نے اندر گھس کر دس سے زیادہ مرتدوں کو قتل کیا اور لڑتے بھڑتے دروازہ کھول دیا۔ باقی مسلمان بھی نعرۂ تکبیر بلند کر کے داخل ہو گئے۔ سخت جنگ ہوئی، مسیلمہ کے دس ہزار فوجی مارے گئے، جبکہ ساڑھے چھ سو اہل ایمان نے جام شہادت نوش کیا۔ کثرت اموات کی وجہ سے اس باغ کا نام ہی حدیقۃ الموت پڑ گیا۔ مسیلمہ کو حضرت وحشی بن حرب اور حضرت ابودجانہ انصاری نے جہنم واصل کیا۔

مدعیۂ نبوت سجاح کے ساتھی زبرقان اور اقرع ارتداد سے توبہ کرنے کے بعد حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور کہا: بحرین کا خراج ہمیں لکھ دیجیے، ہم ضمانت دیتے ہیں کہ ہماری قوم کا کوئی شخص مرتد نہ ہو گا۔ وہ مان گئے اور پروانہ لکھ کر دے دیا۔ بطور گواہ دست خط ثبت کرانے کے لیے یہ پروانہ حضرت عمر کے پاس لے جایا گیا تو انھوں نے دست خط کرنے کے بجائے کاغذ ہی پھاڑ دیا۔ زبرقان اور اقرع نے حضرت خالد بن ولید کے ساتھ یمامہ سمیت تمام

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

معرکوں میں حصہ لیا۔ پھر وہ حضرت شرحبیل بن حسنہ کے ساتھ دومہ پہنچے۔

حضرت علا بن حضرمی بحرین کے مرتدین سے قتال کرنے کے لیے نکلے۔ وہ یمامہ سے گزرے تو حضرت شرحبیل کو بنو قضاعہ کے مرتدین سے نمٹنے کو کہا۔ چنانچہ حضرت عمرو بن عاص نے قبیلۂ سعد اور سرزمین بلق پر حملہ کیا، جبکہ حضرت شرحبیل نے کلب اور اس کے حلیف قبائل پر یورش کی۔ یہ بنو قضاعہ کے بطون (شاخیں) تھے۔

۱۲ھ: مہران بن بہرام اور عقہ بن ابو عقہ عین التمر میں فوج کشی کیے ہوئے تھے۔ انبار فتح کرنے کے بعد حضرت خالد بن ولید نے ادھر کا رخ کیا۔ انھوں نے عقہ کو شکست دی تو مہران قلعہ چھوڑ کر بھاگا، تاہم عقہ کے شکست خوردہ سپاہیوں نے قلعہ میں پناہ لے لی۔ قلعہ زیر کرنے کے بعد حضرت خالد نے عقہ اور تمام سپاہیوں کو قتل کرا دیا۔ قلعہ سے کچھ قیدی اور مال غنیمت حاصل ہوا۔ قیدیوں میں چالیس لڑکے تھے جو انجیل کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انھی میں مشہور مفسر ابن سیرین کے والد سیرین اور شاعر عبداللہ بن عبدالاعلیٰ کے دادا ابوعمرہ بھی تھے۔ حضرت شرحبیل بن حسنہ نے اس معرکے میں حصہ لیا، بنو مرہ کے ابو عمرہ ان کے حصے میں آئے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خلافت راشدہ کے پہلے سال سیدنا ابوبکر عراق میں کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ ۱۲ھ میں وہ حج سے لوٹے تو شام (Levant) بھیجنے کے لیے چار لشکر ترتیب دیے۔ سب سے پہلے انھوں نے یزید بن ابوسفیان کو بالائی شام کے شہر بلقا بھیجا۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت شرحبیل بن حسنہ کو سات ہزار کا لشکر دے کر اردن، حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو حمص (جابیہ) اور حضرت عمرو بن عاص کو فلسطین کے شہر ایلہ (غمر العربات) کی طرف روانہ کیا۔ خلیفۂ اول نے ان کمانڈروں کا تقرر کرنے سے پہلے حضرت سعید بن عاص کو پرچم عطا کیا تھا، لیکن روانگی سے قبل ہی معزول کر کے حضرت یزید بن ابوسفیان کو ذمہ داری سونپ دی۔ اس وقت حضرت خالد بن سعید شام کی سرحد پر متعین اسلامی فوج کے سپہ سالار تھے، انھوں نے سیدنا ابوبکر کی ہدایت کے مطابق سرحدی قبائل کو ساتھ ملا کر مکمل دفاعی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ قیصر روم ہرقل نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے جنگی تیاریاں شروع کر دیں تو سرحدوں پر مقیم عرب قبائل بنو بکر، بنو عذرہ، بنو عدوان اور بنو غسان نے اس کا ساتھ دیا۔ حضرت خالد بن سعید نے مدینہ خط لکھ کر خلیفۂ اول سے حملے میں پہل کرنے کی اجازت چاہی۔ ان کی فوج رومی افواج سے کہیں کمزور تھی، اس لیے سیدنا ابوبکر نے کبار مہاجرین و انصار پر مشتمل شوریٰ طلب کی اور شام کی طرف مزید فوجیں بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضرت عمر نے مکمل تائید کی، جبکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے پوری قوت سے حملہ کرنے کے بجائے چھاپہ مار کارروائی کرنے کی تجویز پیش کی۔ حضرت عثمان نے حضرت ابوبکر کے فیصلے کی حمایت کی تو باقی اہل شوریٰ بھی متفق ہو گئے۔ مدینہ کے باشندے رومی

سلطنت اوراس کی جنگی طاقت سے مرعوب تھے، لیکن جب وہ خلیفۃ المسلمین کی ترغیب پر جوق در جوق شام کو جانے والے لشکر میں شامل ہو گئے تو اہل یمن کو بھی شمولیت کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ ذوالکلاع حمیری، قیس مرادی، جندب دوسی اور حابس طائی اپنا اپنا دستہ لے کر مدینہ پہنچ گئے۔اسی اثنا میں حضرت ابوبکر نے حضرت خالد بن سعید کو شام کی سرحد عبور کرنے کی اجازت دے دی، البتہ حملے میں پہل کرنے سے روکا۔حضرت خالد بن سعید نے مختصر فوج اور بدوی قبائل کے ساتھ تیما سے شام کی حدود میں پیش قدمی شروع کی۔رومیوں نے غسانیوں اور دوسرے سرحدی قبائل کو اپنی پہلی دفاعی لائن بنایا ہوا تھا۔سرحدوں پر مقیم فوجی حواس باختہ ہو کر بھاگے، حضرت خالد نے ان کا چھوڑا ہوا سامان قبضے میں لیا اور حضرت ابوبکر کو اطلاع دی۔انھوں نے جواب بھیجا کہ آگے بڑھتے جاؤ، لیکن جب تک کمک پہنچ نہ جائے خود حملہ کرنے سے پرہیز کرو۔بحر مراد کے مشرقی ساحل پر واقع قسطل کے مقام پر ایک اور رومی لشکر سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی، وہ بھی شکست سے دوچار ہوا۔قیصر کے خود آگے نہ آنے سے شامی عیسائیوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ انھیں قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے، اس لیے وہ لڑائی سے کنارہ کش ہو گئے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سب سے پہلے حضرت ولید بن عقبہ حضرت خالد بن سعید کی مدد کو پہنچے۔حضرت عکرمہ بن ابوجہل حضر موت کی بغاوت سے فارغ ہو کر مدینہ پہنچے تھے، حضرت ابوبکر نے ان کے زیر قیادت ایک نیا لشکر ''جیش بدال'' مرتب کیا اور اسے بھی شام روانہ کر دیا۔حضرت خالد بن سعید دو بار فتح حاصل کرنے کے بعد حد سے زیادہ پر اعتماد ہو چکے تھے، انھوں نے مزید کمک کا انتظار کیے بغیر رومی فوج پر حملہ کرنے کا پروگرام بنا لیا۔رومی سپہ سالار باہان تجربہ کار جنگجو تھا، اپنی فوج لے کر دمشق کو چل پڑا، حضرت خالد نے اس کا پیچھا کیا۔مرج الصفر کے مقام پر وہ پلٹا اور مسلمانوں کا محاصرہ کر کے ان کی پشت کا راستہ کاٹ دیا۔اسی دوران میں ایک دستہ فوج سے الگ ہو گیا، باہان نے حملہ کر کے سب افراد کو شہید کر دیا۔حضرت خالد کا بیٹا حضرت سعید بھی ان میں شامل تھا، بیٹے کی شہادت کی خبر سنی تو حضرت خالد نے ہمت ہار دی، حضرت عکرمہ کو قیادت سپرد کرتے ہوئے وہ اور ولید ایسا فرار ہوئے کہ مدینے کے قریب ذوالمروہ پہنچ کر دم لیا۔حضرت ابوبکر نے ان کو مدینہ آنے سے منع کر دیا، البتہ ان کے ساتھ آئے ہوئے فوجیوں کو حضرت شرحبیل بن حسنہ اور حضرت معاویہ بن ابوسفیان کی قیادت میں واپس بھیج دیا۔کچھ رضا کار حضرت ابوبکر نے مہیا کیے، کچھ حضرت شرحبیل نے حضرت خالد بن سعید کے دستے سے لیے اور اردن (یا بصری) پہنچ گئے۔انھوں نے اردن پر مامور کمانڈر حضرت ولید بن عقبہ کی جگہ لی۔حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے جابیہ، حضرت یزید بن ابوسفیان نے بلقا اور حضرت عمرو بن عاص نے عربہ (عربات) میں ڈیرے ڈال دیے۔راستے میں بدوؤں اور عیسائیوں کی جانب سے کچھ مزاحمت

پیش آئی۔ حضرت ابوعبیدہ نے اہل بلقا کو زیر کرنے کے بعد صلح پر مجبور کیا، یہ شام کے علاقے میں پہلی صلح تھی۔

۱۳ھ (۶۳۴ء): شاہ روم ہرقل کو مسلمانوں کی جنگی تیاریوں کا علم ہوا تو اپنی قوم کو صلح کی تجویز پیش کی، لیکن کوئی نہ مانا۔ تب وہ حمص پہنچا اور چاروں اسلامی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے الگ الگ لشکر تیار کیے۔ اپنے سگے بھائی تذراق کو نوے ہزار کی فوج دے کر حضرت عمرو بن عاص کا مقابلہ کرنے کے لیے فلسطین، جارج (جرجہ) بن توذر کو چالیس ہزار کی سپاہ دے کر حضرت یزید بن ابوسفیان کی طرف دمشق، فیقار بن نسطوس کو ساٹھ ہزار کے لشکر کا سالار مقرر کر کے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کی جانب حمص اور دراقص کو حضرت شرحبیل بن حسنہ کا سامنا کرنے کے لیے اردن بھیجا۔ یہ خبر سن کر مسلمان گھبرائے اور حضرت عمرو بن عاص سے رائے لی۔ انھوں نے خط لکھا کہ ہمیں اکٹھا ہو جانا چاہیے تبھی ہم دشمن کی کثیر تعداد کا مقابلہ کر سکیں گے۔ حضرت ابوبکر سے ہدایت لی گئی تو انھوں نے بھی چاروں فوجوں کو یک جا ہونے کا حکم دیا۔ اب تیس ہزار اہل ایمان کی نفری دو لاکھ چالیس ہزار رومی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے یرموک پر اکٹھی ہو گئی۔ ادھر حضرت ابوبکر نے حضرت عمر، حضرت علی اور دیگر اہل رائے کے مشورہ سے حضرت خالد بن ولید کو فوج کی قیادت سونپنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت خالد بہت آزردہ ہوئے، کیونکہ وہ ساسانی (Sassanid) دارالخلافہ مدائن کو فتح کیے بغیر عراق سے ہلنا نہ چاہتے تھے، تاہم از راہ امتثال امر انھوں نے حضرت مثنیٰ بن حارثہ کو عراق کا کمانڈر مقرر کیا اور ساڑھے نو ہزار کی فوج لے کر شام روانہ ہو گئے۔ پہلے سوا، تدمر، ارو کہ (ارک) اور سخنہ کے قلعے فتح کیے، پھر بصریٰ کا رخ کیا۔ دمشق کو پیچھے چھوڑ کر وہ مرج راہط پہنچے، ایک مختصر حملہ کر کے کچھ مال غنیمت اور کچھ قیدی حاصل کیے، پھر یہ شہر خالی کر دیا۔ ان کا مقصد اگلی مہمات کے لیے عقب کو محفوظ بنانا تھا۔ حضرت خالد کی آمد کی خبر سن کر حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے حضرت شرحبیل بن حسنہ کو چار ہزار جوان دے کر بصریٰ کا محاصرہ کرنے کے لیے بھیجا۔ بازنطینی اور عرب عیسائیوں کی ایک بڑی فوج نے حضرت شرحبیل کی فوج پر اچانک حملہ کیا، حضرت شرحبیل کی قوت منتشر ہونے کو تھی کہ حضرت خالد کا گھڑ سوار دستہ آن پہنچا اور رومی فوج پر عقب سے حملہ کر دیا۔ اس نے بھاگ کر قلعے میں پناہ لے لی، اسی اثنا میں حضرت ابوعبیدہ بھی فوج لے کر پہنچے اور حضرت خالد کی کمان میں آ گئے۔ اسلامی فوج نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اہل بصریٰ نے جزیہ ادائی کی شرط مان کر صلح کر لی اور قلعہ خالی کر دیا۔ شام کے شہروں میں یہ پہلا شہر تھا جو عہد صدیقی میں فتح ہوا، اس کے ساتھ ہی غسانی سلطنت (Ghassanids) کا خاتمہ ہو گیا۔ بلال بن حارث مزنی کو مال غنیمت دے کر مدینہ بھیجا گیا۔ پھر حضرت خالد، حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت شرحبیل بن



www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حسنہ اور حضرت یزید بن ابوسفیان چاروں جرنیل حضرت عمرو بن عاص کو کمک دینے کے لیے فلسطین کے شہر عربات (عربا) روانہ ہو گئے۔

جمادی الاولیٰ ۱۳ھ (۳۰/ جولائی ۶۳۴ء، ۱۵ھ: ابن کثیر) جنگ اجنادین: حضرت خالد بصریٰ میں تھے کہ اطلاع ملی کہ رومی فوج رملہ اور بیت جبرین کے مابین واقع شہر اجنادین (Palaestina Prima) میں جمع ہو رہی ہے۔ یہ موجودہ اسرائیل کے مقام بیت شیمش (Beit Shemesh) کے جنوب میں ہے۔ حضرت خالد نے حضرت یزید بن ابوسفیان، حضرت عمرو بن عاص، حضرت ابوعبیدہ اور حضرت شرحبیل کے دستوں کو یک جا کیا تو اسلامی فوج کی تعداد بیس ہزار ہو گئی، جبکہ رومیوں کی نفری ساٹھ ہزار تھی۔ انھوں نے قلب پر حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عمرو بن عاص، میسرہ پر حضرت سعید بن عامر، میمنہ پر حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر اور ساقہ پر حضرت یزید بن ابوسفیان کو مقرر کیا۔ جنگ اجنادین کے پہلے روز رومیوں نے پیادہ (infantary) فوج کے ذریعے حملہ کیا، تیر اندازی سے کئی مسلمان شہید اور زخمی ہو گئے۔ دوبدو لڑائی اور عمومی حملہ بھی ہوا، تاہم کسی فوج کا پلہ بھاری نہ ہو سکا۔ دوسرے دن حضرت ضرار بن خطاب نے رومی کمانڈر تھیوڈور کو قتل کیا۔ بازنطینی فوج کے قدم اکھڑے تو اسلامی فوج نے زوردار حملہ کر دیا۔ بہت جانی نقصان اٹھانے کے باوجود پسپا نہ ہوئی تو حضرت خالد نے یزید کے دستے کو بھی بلا لیا۔ اس آخری ہلے نے رومیوں کو ڈھیر کر دیا۔ جو بچ گئے، وہ غزہ، جافہ اور یروشلم کی طرف فرار ہو گئے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ایشاز یر کرنے کے بعد حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے شمالی شام فتح کرنے کا پلان بنایا اور فوج کو یرموک (Hieromyax) منتقل کر دیا۔ یہ دریاے یرموک کے ساتھ، گولان کی پہاڑیوں کے جنوب مشرق میں چالیس میل کے فاصلے پر ایک سطح مرتفع ہے جو موجودہ اسرائیل، اردن اور شام کی درمیانی سرحد پر واقع ہے۔ اس کے مغربی کنارے پر رقاد نام کی ساڑھے چھ سو فٹ گہری کھائی ہے۔ اسلامی فوج طلال جموع (Hill of Samein) پر جمع ہوئی اور رومی فوج نے دیر ایوب اور دریاے یرموک کے بیچ وادئ واقوصہ میں پڑاؤ ڈالا جو تین اطراف سے اونچی پہاڑیوں میں گھری ہوئی تھی۔ باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا جس پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ رومیوں کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار ہو چکی تھی، جبکہ اہل ایمان کی نفری چالیس ہزار سے بھی کم (چھیالیس ہزار: طبری) تھی، صحابہ کی تعداد ایک ہزار تھی جن میں سے سو بدری تھے، عشرۂ مبشرہ میں سے حضرت زبیر بن عوام موجود تھے۔ چار اہم جرنیلوں حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت عمرو بن عاص، حضرت یزید بن ابوسفیان اور حضرت شرحبیل بن حسنہ کی فوجیں اپنے اپنے سالار کی کمان میں

جنگ کے لیے تیار تھیں۔ حضرت خالد نے مشورہ دیا کہ فوجوں کو یک جا کر کے باری باری ہر جرنیل کو سالاری کا موقع دیا جائے۔ کمانڈ حضرت خالد نے سنبھالی تو چھتیس یا چالیس کمانڈروں کی سربراہی میں ہزار ہزار جوانوں پر مشتمل دستے ترتیب دیے۔ قلب کی کمان حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو، میمنہ کی حضرت عمرو بن عاص اور حضرت شرحبیل بن حسنہ کو، میسرہ کی حضرت یزید بن ابوسفیان کو، مقدمہ کی حضرت قباث بن اشیم کو اور ساقہ کی حضرت عبداللہ بن مسعود کو سونپی۔ میمنہ کی ذمہ داری ادا کرنے کے ساتھ حضرت شرحبیل ایک دستہ کی کمان بھی کر رہے تھے۔ حضرت ابوالدردا اس دن قاضی تھے، حضرت ابوسفیان سپاہیوں کو جوش دلا رہے اور حضرت مقداد بن اسود قرآنی آیات کی تلاوت کر رہے تھے۔ ابن اسحاق کی روایت میں کمانڈروں کے نام اس طرح ہیں: لشکر کے چار حصوں کے سربراہ: حضرت ابوعبیدہ، حضرت عمرو بن عاص، حضرت شرحبیل بن حسنہ اور حضرت یزید بن ابوسفیان۔ قائد میمنہ: حضرت معاذ بن جبل، کمان دار میسرہ: حضرت نفاثہ بن اسامہ، پیادہ فوج کے سالار: حضرت ہاشم بن عتبہ اور گھڑسوار فوج کے قائد: حضرت خالد بن ولید۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

طبری اور ابن کثیر نے سیف بن عمر کی روایت کو اختیار کیا ہے جس کے مطابق معرکۂ یرموک ۱۳ھ میں فتح دمشق سے پہلے پیش آیا۔ ابن عساکر کی نقل کردہ روایات کے مطابق، جنھیں موجودہ مؤرخین نے ترجیح دی ہے، جنگ یرموک فتح دمشق کے بعد رجب ۱۵ھ (۱۵ تا ۲۰ / اگست ۶۳۶ء) میں ہوئی۔ ذہبی کہتے ہیں: ۱۳ھ والی روایت وہم ہے۔

جنگ یرموک چھ دن جاری رہی۔ پہلے دن کی مبارزت میں رومیوں کے کئی کمانڈر مارے گئے۔ ایک تہائی رومی فوج نے جنگ میں حصہ لیا اور کوئی خاص کارکردگی نہ دکھائی۔ رومی سپہ سالار باہان (واہان) کا مقصد مسلمانوں کی قوت کا اندازہ کرنا تھا۔ دوران جنگ میں رومی جرنیل جارج (George) نے اسلام قبول کیا، جنگ میں حصہ لیا اور شام سے پہلے جام شہادت نوش کیا۔ دوسرے دن علی الصبح رومی غلاموں پر مشتمل میسرہ نے دیرجان (یا قناطیر) کی سربراہی میں مسلم میمنہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ کمانڈر حضرت عمرو بن عاص نے ایک بار تو رومیوں کی یلغار روک لی، لیکن پھر قلب کی طرف پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اس دباؤ کو زبید قبیلہ کے افراد نے کم کیا، وہ پیچھے ہٹے پھر نعرہ بلند کر پلٹے اور زوردار حملہ کر کے رومیوں کو ہٹا دیا۔ حضرت خالد بن ولید نے میمنہ کی پوزیشن مستحکم کرنے کے بعد اسے رومی لشکر کے میسرہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ خود اپنا دستہ لے کر وہ دوسری جانب سے میسرہ پر چڑھ دوڑے۔ رومیوں نے گھبرا کر مسلم فوج کی پوزیشنیں چھوڑ دیں اور حضرت عمرو بن عاص ان پر واپس آ گئے۔ اس کے برعکس مسلم میسرہ دباؤ میں

رہا، حتیٰ کہ حضرت یزید بن ابوسفیان کو قلب کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ حضرت خالد نے ضرار بن ازور کے دستے کو رومی فوج کے قلب پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ رومی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹے، غروب آفتاب تک دونوں فوجیں پہلی پوزیشنوں تک آ چکی تھیں۔ ضرار کے حملے میں بے شمار مسلمانوں نے شہادت پائی، جبکہ لاتعداد رومی سپاہی اور ان کا جرنیل دیرجان جہنم واصل ہوئے۔ تیسرے دن بازنطینی فوج کے مسلم میمنہ اور ملحقہ قلب پر حملے سے دن کا آغاز ہوا۔ اسلامی فوج کچھ پیچھے ہٹی، لیکن پھر سنبھلی اور جوابی حملے کے لیے تیار ہوگئی۔ حضرت خالد نے رومی فوج کے میسرہ پر اندرونی جانب سے یلغار کی، ساتھ ہی اپنی فوج کے میمنہ کو اس کے بیرونی طرف حملہ کرنے کا حکم دیا۔ گھمسان کی جنگ میں طرفین کا جانی نقصان ہوا اور رومی فوج پیش قدمی کرنے میں ناکام رہی۔ چوتھے دن رومی میسرہ میں شامل غلاموں کی بٹالین نے قناطیر کی سربراہی میں اسلامی میمنہ پر دوبارہ حملہ کیا، عیسائی عربوں نے جبلہ کی کمان میں ان کی مدد کی۔ نتیجۃً میمنہ پیچھے ہٹا۔ اسی اثنا میں حضرت خالد اپنے دستے کے ساتھ داخل ہوئے اور میسرہ اور قلب کے کمانڈروں حضرت ابوعبیدہ اور حضرت یزید کے ساتھ مل کر ایسا زوردار حملہ کیا کہ رومی فوج کے لیے آگے بڑھنا ممکن نہ رہا۔ حضرت خالد نے اپنے دستے کو دو حصوں میں بانٹ کر رومی میسرہ کے دونوں پہلوؤں پر حملہ کیا۔ اسی وقت مسلم قلب نے رومی فوج کے فرنٹ کو اور میمنہ نے ان کے میسرہ کو نشانہ بنایا۔ اس چوطرفی حملے میں رومی قلب اور میسرہ، دونوں پسپا ہو گئے، لیکن دوسری جانب رومی گھڑسواروں نے مسلم قلب اور میسرہ پر تیراندازی کر کے ان کی پیش قدمی روک دی۔ کئی مسلم سپاہیوں کی آنکھیں تیر لگنے سے ضائع ہوئیں، ابوسفیان کی دوسری آنکھ اسی دن پھوٹی، پہلی طائف کے محاصرے میں ضائع ہو چکی تھی۔ حضرت عکرمہ کے دستے نے فوج کو سنبھالا دیا اور رومی فوج پر جوابی حملہ کیا۔ اسی اثنا میں پیچھے ہٹنے والے دستے بھی سنبھلنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کوشش میں عکرمہ کے بے شمار جوان شہید اور زخمی ہوئے، وہ خود بھی اسی دن شہادت سے سرفراز ہوئے۔ پانچویں دن شدید جانی نقصان اٹھانے کے بعد باہان نے عارضی جنگ بندی کی استدعا کی۔ حضرت خالد نے اسے اپنی فتح جانا، اس لیے مسترد کرتے ہوئے جارحانہ جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے رومی فوج کے فرار کے راستوں کو مسدود کرنے کے لیے الگ نفری مقرر کی۔ میدان جنگ میں تین گہری کھائیوں کے علاوہ مغرب کی سمت میں وادئ رقاد، جنوب میں وادئ یرموک اور مشرق میں وادئ الان تھی۔ ان اطراف میں بازنطینی فوج کا جانا ممکن نہ تھا، اس لیے انھوں نے صرف شمال کی سمت بلاک کی۔ اس کے علاوہ پانسو سپاہیوں پر مشتمل ضرار بن ازور کے دستے کو بھیج کر وادئ رقاد پر واقع واحد پل پر بھی قبضہ کر لیا۔ چھٹے دن حضرت

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خالد بن ولید نے محض ایک سو گھڑ سواروں کو یک جا کر کے دفعتہً ایسا دھاوا بولا کہ ایک لاکھ رومی تتر بتر ہو گئے۔ ان میں سے چھ ہزار اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور باقیوں کو کوئی جائے پناہ نہ مل رہی تھی۔ باہان نے اپنی فوج کے گھڑ سوار دستوں کو یک جا ہونے کا حکم دیا، لیکن مسلم گھڑ سواروں کے شدید حملے کے دوران میں ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ نتیجۃً انھیں اکھڑ کر شمال کی سمت میں پسپا ہونا پڑا۔ اس طرح رومی پیادہ فوج کو کوئی سپورٹ نہ رہی۔ حضرت خالد نے رومی قلب پر حملہ کر کے اسے مکمل طور پر منتشر کر دیا۔ رومی بازنطینی فوج کی شکست یقینی ہو گئی تو حضرت خالد نے اس کی راہ فرار مسدود کرنے کے لیے اپنا دستہ بھی شمال کی طرف منتقل کر دیا۔ رومی مغرب کی سمت میں وادئ رقاد کی طرف پسپا ہوئے، ان کی کوشش تھی کہ عین الصخر کے تنگ پل کو عبور کر کے نکل جائیں، لیکن وہاں ضرار بن ازور پانسو جوانوں کے ساتھ رات سے قابض تھے۔ اسلامی فوج کے دباؤ میں رومی فوج ایسی کسی گئی کہ اس کے لیے ہتھیار چلانا بھی ممکن نہ رہا۔ لاتعداد سپاہی گہری کھائی میں گر کر مارے گئے، جنھوں نے پانی کے راستے فرار ہونے کی کوشش کی، وہ بھی نہ بچ پائے۔ پھر بھی کئی رومیوں نے مصر، ایشیا اور دمشق کو راہ فرار پکڑی۔ بہت کم رومی قید میں آئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد حضرت خالد نے رومی بھگوڑوں کا دمشق تک پیچھا کیا۔ باہان (واہان) وہیں مارا گیا۔ دمشق کے مقامی باشندوں نے حضرت خالد کو خوش آمدید کہا۔ اس جنگ کے نتیجے میں ہرقل کو شام چھوڑنا پڑا، وہ سمندر کے راستے قسطنطنیہ روانہ ہو گیا۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مولانا حمید الدین فراہی

# ترتیب ونظام قرآن

[مولانا فراہی کی ایک نادر اردو تحریر]

جس طرح اقسام کلام مختلف ہیں، اسی طرح ان کی ترتیب اور نظام جداگانہ اصول رکھتے ہیں۔ نظام کے لحاظ سے ہم کلام کی دو قسم قرار دیتے ہیں: اول مظہر جو واقعات یا حقائق کو محض ظاہر کر دیتا ہے۔ جس طرح وہ کلام جو قانون و احکام یا تاریخ وقصص یا طبعیات وریاضیات پر مشتمل ہو۔ دوسرا موثر جو انسان میں ایک حرکت ڈال دے اور اس میں جوش یا شوق یا رغبت یا نفرت یا سرور وغم پیدا کر دیتا ہے۔ جس طرح وہ کلام جو وعظ یا مباحثہ یا مدح وذم یا شادی وغم وغیرہ پر مشتمل ہو۔

یہ تقسیم عقلی اگرچہ دو جداگانہ قسم بنا دیتی ہے، مگر مصنفین اکثر کسی مصلحت سے دونوں کو مختلط کر دیتے ہیں۔ مثلاً تاریخ کی کتاب میں کبھی ایسے چھپے ہوئے نشتر رکھ دیتے ہیں جن سے پڑھنے والے کے دل میں ایک ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض واقعات فی نفسہٖ موثر ہوتے ہیں، جس طرح شہادت مظلومان کربلا۔ لیکن اس میں کلام کو دخل نہیں ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص واقعۂ شہادت کے محض بیان پر اکتفا کرے تو ہم کہیں گے کہ یہ اثر طرز کلام نے نہیں پیدا کیا، بلکہ ان واقعات نے پیدا کیا اور اس لیے وہ کلام محض بیان واقعہ اور مظہر ہو گا، مگر جبکہ ہم اس میں یہ کوشش کریں کہ اس واقعہ کی تصویر اسی رنگ وروپ کے ساتھ پیش کریں، جیسا کہ اس وقت میں دیکھنے والوں کو نظر آتی تھی تو اس میں ہمیں خاص ترتیب اور نئی صنعت سے کام لینا پڑے گا اور اس وقت بجاے ایک مورخ کے ہم انیس ودبیر بن جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ ایسے دو مختلف کلام کی ترتیب کے لیے ضرور مختلف اصول ہونے چاہییں۔ کلام مظہر کی ترتیب کے کیا

اصول ہیں؟ میری بحث سے خارج ہے۔ مجھے صرف قرآن کی ترتیب سے بحث کرنی ہے اور وہ بحیثیت اغلط کلام موثر کی قسم میں داخل ہے جس نے عرب کے بند پانی میں ایسی حرکت ڈال دی کہ سیلاب بن کر فاران کے دروں سے ٹکر کھاتا ہوا اترا اور چشم زدن میں روے زمین پر پھر گیا اور اس کو کفر و شرک کی نجاست سے دھوڈالا۔ بقول حالی:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی

عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

بے شک، ہم کو صرف موثر کلام کی ترتیب سے بحث کرنا ہے، لیکن ہم چند مثالوں سے کلام مظہر اور موثر کا فرق ظاہر کریں گے۔ 'و بضدها تتبين الأشياء'۔

فرض کرو کہ عطار کی دکان میں مفرد دوائیں ترتیب سے رکھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ عطار ان کو اس ترتیب سے رکھے گا کہ ان کی حفاظت میں، ان کے ڈھونڈھنے میں، ان کی کافی مقدار مہیا رکھنے میں، اس کو آسانی ہو۔ انھی دواؤں کی ترتیب علم الادویہ میں کی جاتی ہے جو ان کے آثار پیدایش کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اب انھی دواؤں کو ایک طبیب معالجہ کی غرض سے ترتیب دیتا ہے۔ ان کی مقدار مقرر کرتا ہے، کبھی کسی دوا کی مقدار کم اور کبھی زیادہ کرتا ہے۔ خود ہی اپنے نسخہ کو کبھی بدل دیتا ہے، بعض نئے اجزا اس میں داخل کرتا ہے، بعض پرانے نکال ڈالتا ہے تاکہ وہ اثر جو بیمار کے مزاج پر پیدا کرنا اس کو منظور ہے، حاصل ہو۔ طبیب کی ترتیب نہ صرف عطار کی ترتیب سے مختلف ہوتی ہے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور مشکل سے سمجھ میں آنے والی ہوتی ہے، کسی اناڑی کو جو عطار خانہ کی ترتیب اس میں ڈھونڈھنا چاہتا ہو، نسخہ کے اجزا بالکل خبط بے ربط معلوم ہوں گے، مختلف نسخوں میں اس کو تناقض نظر آئے گا، وہ کہے گا کہ دیکھو ایک نسخہ میں حکیم صاحب یوں لکھتے ہیں اور دوسرے میں خود ہی اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن یہ ترتیب اس وقت صاف نظر آنے لگتی ہے جب یہ معلوم ہو کہ مختلف اوقات میں بیمار کے مزاج کی کیا حالت تھی اور کس وقت کن اجزا کی اس کو احتیاج تھی۔

پس محرک (موثر) کلام کی ترتیب صرف اس امر کو پیش نظر رکھتی ہے کہ کیونکر سامعین پر موثر ہو۔ اب ہمیں یہ دکھانا ہے کہ ان کی ترتیب کے مناہج کیا ہیں؟

یہ کلام ایک خاص گروہ کو مخاطب کرتا ہے اور اس لیے ان کی حالت کے بالکل مناسب ہوتا ہے اور چونکہ حالات نوع انسان اور حالات قرون مختلفہ بدلتے رہتے ہیں، اس لیے کیونکر ممکن ہے کہ ایک ہی لباس ہر جسم پر ٹھیک آئے، جو شخص اس کلام کا مخاطب صحیح نہیں ہے، اس کو وہ کلام بے اثر و بے موقع معلوم ہو گا۔ قرآن کے مطالعہ کے وقت عموماً ہر

شخص کو یہی امر ذہن نشین ہوتا ہے کہ ہم اس کے مخاطب ہیں، حالاں کہ اس کا روے سخن ایسے گروہ کی طرف ہے جن کے حالات وخیالات اور جذبات اور توہمات ہم میں بالکل نہیں۔

## وسائل انکشاف نظم قرآن

ہم کو لازم ہے کہ زمانۂ نزول قرآن کی پوری حالت تمدن سے ہم واقف ہوں:

۱۔ ہم کو اس وقت کے یہود ونصاریٰ ومشرکین وصابئین وغیرہ کے مذاہب ومعتقدات سے واقف ہونا چاہیے۔

۲۔ ہم کو عرب کے عام توہمات کو دریافت کرنا چاہیے۔

۳۔ ہم کو جاننا چاہیے کہ نزول قرآن کی مدت میں کیا کیا واقعات نئے پیدا ہوئے اور ان سے عرب کی مختلف جماعتوں میں کیا کیا مختلف باتیں زیر بحث آ گئیں۔ کیا کیا ملکی وتمدنی جھگڑے چھڑ گئے اور تمام عرب میں کیا شورش پیدا ہوگئی؟

۴۔ ہم کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ عرب کس قدر روحشی اور تندمزاج تھے اور اس لیے کس قسم کے کلام سے متاثر ہو سکتے تھے۔

۵۔ ہم کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ عرب کا مذاق سخن کیا تھا۔ کس قسم کے کلام کے سننے اور بولنے کے وہ عادی تھے۔ رزم و بزم میں ان کا خطیب کس روش پر چلتا تھا۔ ایجاز واطناب، ترصیع وترکیب اور دیگر اسالیب خطابت کو وہ کیونکر استعمال کرتے تھے۔

۶۔ اور بالآخر ہم کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ عرب کے ذہن میں اخلاق کے مدارج نیک وبد کیا تھے۔ اگر چہ اس سے زیادہ تر احکام قرآن کے سمجھنے میں مدد ملے گی، لیکن نظم قرآن بھی اس کو بیش تر ملحوظ رکھتا ہے۔

ان امور مذکورہ بالا میں جو آگہی تاریخ سے متعلق ہیں، ان کے لیے کتب تاریخ کافی ہیں۔ مجھے اس پر اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ فہم قرآن کے لیے ان کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ یہ امور بالخصوص ذہن نشین ہوں، لیکن عرب کے اسالیب خطابت کو مجھے تفصیلاً بیان کرنا ہے۔

## نثر عرب

نثر عرب مدون نہ ہوئی اور سوائے چند کلمات ومختصر خطبات کے جو بطور تبرک چلے آتے ہیں، ہمارے پاس بہت کم مثالیں ہیں۔

۱۔ جس سے ان کا طرز کلام معلوم ہو، جاحظ نے جو فقرات وخطبات جمع کیے ہیں، وہ آٹھ دس سطروں سے زائد نہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۲۔ ''نہج البلاغۃ'' میں بے شک مطول خطبات ہیں، لیکن اول تو وہ ایک خاص شخص کا کلام ہے جس سے تمام عرب کے کلام پر رائے قائم کرنی مشکل ہوگی۔ دوسرے وہ کلام اہل نظر کے نزدیک جو اصول درایت کو عامیانہ تقلید پر ترجیح دیتا ہو۔ تیسری اور چوتھی صدی سے پیش تر کا نہیں ہوسکتا۔

۳۔ احادیث آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول تو بالمعنی مروی ہیں۔ دوسرے نہایت مختصر۔ تیسرے بیش تر وہ قانونی جملے ہیں نہ کہ خطیب کے گرم گرم اور برجستہ فقرات۔

بہرحال، یہی ذخیرہ ہے جس سے کچھ کچھ اسلوب کلام عرب منکشف ہوتا ہے۔ ہاں، قرآن بجاے خود ایک مکمل ذخیرہ ہے اور اگرچہ عام اصول کے مطابق اس پر روشنی ڈالنے کے لیے کوئی اور کلام چاہیے تھا، لیکن بعض چیزیں اپنی آپ ہی نظیر ہیں۔ اسی کو بار بار دیکھو اور اس کے محاسن کو سمجھو:

آفتاب آمد دلیل آفتاب
گر دلیلش خواہی از وے رخ متاب

نظم عرب اور نثر عرب جس قدر موجود ہے، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کہیں کہیں اسی انداز پر ہے۔ مسجع فقرات جیسا کہ سورۂ مدثر وغیرہ میں ہیں۔ نثر عرب سے کلی مشابہت رکھتے ہیں، مگر جہاں کلام نہایت رواں اور پرزور ہے؛ جہاں نہر کی چھوٹی لہروں کے مشابہ نہیں، بلکہ طوفانی سمندر کے تلاطم اور آب شاروں کے زور وشور کی طرح، سلسلۂ سخن نہایت وسیع پیمانہ پر بڑھتا اور سمٹتا، چڑھتا اور اترتا ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ وغیرہ میں نظر آتا ہے، ایسے کلام کی مثال نثر عرب میں نہیں ملتی۔ مگر اس کی علت یہ نہیں ہے کہ عرب کے خطبات محض مسجع اور مقتضب ہی ہوا کرتے تھے، بلکہ رواۃ کو ان کا محفوظ رکھنا دشوار تھا۔ مسجع فقرے آسانی سے یاد رہ جاتے ہیں، مگر لمبی لمبی تقریریں جن کا اعادہ خود مقرر نہیں کرسکتا، کون یاد کرسکتا ہے؟ کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا خطبہ، ثقیفہ میں، جس نے عرب کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو مستحکم کر دیا، ایسا ہی مختصر تھا، جیسا کہ منقول ہے؟ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس خطبہ میں کوئی بات نہیں چھوڑی۔ انصار کے محاسن، مہاجرین کے فضائل ایک ایک کر کے ذکر کیے۔'' آج اگر ہمارے پاس عرب کے پرزور خطبے بہ تمامہا ہوتے تو بلاشبہ قرآن کے اسلوب سمجھنے کے لیے چراغ راہ ہوتے۔

## نظم قرآن کیوں مخفی رہا؟

خفاے نظم کی وجہ یہ ہوئی کہ قرآن کو عموماً یا تو مجموعۂ قوانین کی حیثیت سے دیکھا گیا یا علمی کتاب کے مشابہ مانا گیا۔

صحف انبیا میں کوئی وعظ اور کوئی گیت اور کوئی خواب اور کوئی تاریخ وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں اور اس لیے ان کا اسلوب بالکل اسی حالت سے مناسب معلوم ہوتا ہے مگر قرآن کی نسبت ایک مبہم سا خیال مجموعۂ قانون یا کتاب کا قائم ہو گیا۔ اگر ہر سورہ پر خاص عنوان لکھا ہوتا یا چند مجموعۂ آیات کی قطعات قائم کی جاتیں تو ترتیب معلوم پڑتی اور نیز پہلے ہی سے یہ بھی یقین ہے کہ چوں کہ یہ نجماً نجماً نازل ہوا ہے، اس لیے اس میں تسلسل ڈھونڈنا عبث ہے۔

نظم قرآن کے خفا کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ علما نے قرآن کے لفظ لفظ سے مسائل اخذ کیے ہیں۔ اس شوق میں کہ منطقی طور پر جو کچھ اس سے مستنبط ہو، منصوص سمجھا جائے۔ سیاق وسباق کی طرف کچھ لحاظ نہ کیا اور جس طرح امام بخاری نے ایک حدیث کو متعدد ابواب میں ذکر کر کے اس سے چند در چند مسائل مستنبط کیے ہیں۔ مفسرین نے ایک ایک آیت کو مضامین متنوعہ کا منبع قرار دیا۔ پھر یہ کیونکر پتا لگے کہ یہ آیت کس امر کو اصلی طور پر اور کس امر کو ضمناً بیان کرتی ہے اور لامحالہ اس کشاکش مضامین میں سر رشتۂ نظم ہاتھ سے جاتا رہا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

## کلام موثر کی ترتیب

کلام موثر میں اصل مدعا یا عمود کلام کبھی مفرد ہوتا ہے اور کبھی متعدد۔ عمود کلام کے سوا اکثر تمہید اور مقطع بھی اجزاے کلام میں داخل ہوتے ہیں۔ جبکہ عمود کلام پہلے سے معلوم نہ ہو، یعنی یہ نہ بتایا گیا ہو کہ فلاں امر پر گفتگو کی جائے گی۔ جیسا کہ قرآن کی حالت ہے تو چونکہ تمہید کبھی مختصر اور کبھی مسطول اور کبھی قریب اور کبھی بعید اور کبھی مفرد اور کبھی مسلسل ہوتی ہے۔ اس لیے جب تک پورے کلام پر غور سے عبور نہ کیا جائے، اصل مدعا کا پتا نہیں لگتا۔

شاہ ولی اللہ[1] صاحب نے قرآن کو شاہی خطوط سے مشابہ مانا ہے جو مختلف احکام اور ہدایات پر شامل ہو اور حسب ضرورت وقت مختلف ہدایتیں کی گئی ہوں۔ مگر چونکہ عنوان نہیں لکھا گیا، اس لیے منتشر معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت میں چونکہ لوگ واقف تھے کہ فلاں امور درپیش ہیں، اس لیے ان کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام باتیں بالکل حسب موقع وضرورت ہیں۔ مگر آج ان کا حسب موقع ہونا مخفی ہے، گویا شاہ صاحب ترتیب کو نہیں مانتے اور ضروری بھی نہیں سمجھتے۔ یہ خیال ایک حد تک بالکل صحیح ہے، لیکن یہ امر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ عنوان قائم کیا جائے اور وہی رکوع کی بنیاد ہو۔

(جنوری ۱۹۳۶ء، قرآنی مقالات ۱۱-۱۵)

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی، الفوز الکبیر، (عربی ترجمہ: سلمان الحسینی الندوی)، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۱۹۸۴ء، ۱۲۷-۱۲۸۔

مولانا امین احسن اصلاحی

# مسلمان نوجوانوں کے فرائض

[ایک تقریر جو ۱۹۶۷ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات میں اساتذہ، طلبہ اور طالبات کے سامنے کی گئی۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرات اساتذہ اور عزیز طلبہ و طالبات!

میں آپ کی اس ذرہ نوازی کے لیے شکرگزار ہوں کہ آپ نے اپنی اس علمی مجلس میں مجھے تقریر کی دعوت دی۔ میں نے آپ کے نمائندوں سے معذرت کر دی تھی کہ میں کوئی تقریر تو نہیں کروں گا، البتہ آپ کے تجویز کردہ عنوان پر کچھ متفرق باتیں طلبہ و طالبات کے سامنے عرض کر دوں گا۔ تقریر کا معاملہ یہ ہے کہ نوجوانی میں تو آدمی تقریر شوقیہ کرتا ہے، ادھیڑ پن میں فرائض اور ذمہ داریوں کے تحت یہ کام کرنا پڑتا ہے، لیکن بڑھاپے میں آ کر یہ چیز بوجھ بن جاتی ہے۔ میرا حال یہ ہے کہ میں جوانی میں بھی اس ذمہ داری سے گھبراتا رہا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اب اس دور میں میرے لیے یہ کام کتنا مشکل بن گیا ہوگا۔

بہرحال آپ کا دل رکھنے کے لیے کچھ باتیں کہوں گا، آپ ان کو نصیحت کے طور پر سمجھیے۔ میں اگرچہ اپنے آپ کو نصیحت و موعظت کا اہل نہیں سمجھتا، لیکن آدمی کو بعض حقوق مجرد اس بنیاد پر حاصل ہو جاتے ہیں کہ اس کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ مجھے بھی 'بزرگی بعقل است' والی بزرگی چاہے حاصل نہ ہوئی ہو، لیکن 'بزرگی بسال' والی بزرگی تو بہرحال حاصل ہے۔

نصیحت و حکمت کا معاملہ یہ ہے کہ اگر سننے والوں کے دل نصیحت پذیر ہوں تو اس بات سے کچھ زیادہ فرق پیدا

نہیں ہوتا کہ خود نصیحت کرنے والا واعظ بے عمل ہے یا ناصح باعمل۔ سعدی کی وہ حکایت شاید آپ کو یاد ہو کہ 'از لقمان پرسیدند کہ حکمت از کہ آموختی؟ گفت: از ناداناں!' لقمان سے پوچھا گیا کہ آپ نے حکمت کس سے سیکھی؟ انھوں نے جواب دیا کہ نادانوں سے۔ میں یہی توقع آپ سے رکھتا ہوں۔

نوجوانوں کے فرائض سے متعلق مجھے آپ کے سامنے کوئی نئی بات نہیں کہنی ہے۔ میں بھی وہی بات کہوں گا جو بہتوں کی زبانی آپ نے سنی ہوگی۔ بعض باتیں بڑی اہم اور بڑے نکتے کی ہوتی ہیں، لیکن وہ ہر مجلس میں بار بار دہرائے جانے کے سبب سے بالکل پامال اور فرسودہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ اس وجہ سے سننے والے ان کو کماحقہٗ اہمیت نہیں دیتے۔ یہ صورت حال بڑی افسوس ناک ہے۔ اس طرح ہماری زندگی کے بہت سے بنیادی حقائق نے اپنی اصلی معنویت بالکل کھودی ہے۔ لیکن حضرات، حقیقت بہر حال حقیقت ہے، اس کو اس کی اصلی قدر و قیمت سے اس لیے محروم نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو بہتوں نے بیان کیا ہے یا بہت سے بیان کرنے والوں نے محض رسماً بیان کیا ہے۔

میرے نزدیک انھی مظلوم حقیقتوں میں سے یہ حقیقت بھی ہے کہ ہر قوم کے مستقبل کا انحصار اس کے نوجوانوں پر ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ دنیا کی عظیم سچائیوں میں سے ایک عظیم سچائی ہے۔ خواہ ہم اس کی قدر کریں یا نہ کریں۔ قومیں اپنے رقبوں، اپنی عمارتوں، اپنے باغوں اور چمنوں، اپنے دریاؤں اور پہاڑوں سے باقی نہیں رہتی ہیں، بلکہ اپنی آیندہ نسلوں اور اپنے نوجوانوں سے باقی رہتی ہیں۔ نوجوان اچھے ہوں تو قوم زندہ رہے گی۔ اگر اس کے پاس دریا اور پہاڑ نہ ہوں گے تو وہ اپنے لیے نئے دریا اور نئے پہاڑ پیدا کرلے گی۔ برعکس اس کے، نوجوان مردہ ہوں تو اشبیلیہ، غرناطہ اور قرطبہ کی عظمتیں تعمیر کرنے والے بھی صرف تاریخ کی ایک داستان عبرت بن کے رہ جاتے ہیں۔

یہی نکتہ ہے کہ دنیا کی ہر زندہ رہنے والی قوم نے سب سے زیادہ اہمیت اپنے نوجوانوں کی اصلاح و تربیت کو دی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں کو یہ بات عزیز ہوتی ہے کہ صفحۂ عالم میں ان کا مادی وجود بھی قائم رہے اور ان کی معنوی ہستی بھی کارفرما رہے، انھوں نے اپنے بام و در کی آرایش کے بجائے اپنے آگے آنے والے اخلاف کی تہذیب و تربیت کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ میں تاریخ کا طالب علم نہیں ہوں، لیکن سپارٹا کے لوگوں سے لے کر آج تک قابل ذکر قوموں کے جو حالات سرسری طور پر معلوم ہوئے ہیں، ان کی بنا پر یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ رومی و یونانی ہوں یا انگریز و امریکن، دنیا کے نقشے پر کوئی پایدار نقش اسی قوم نے چھوڑا ہے جس نے اپنی آنے والی نسل کی فکر کی ہے۔ سپارٹا والوں کے متعلق میں نے کہیں پڑھا ہے کہ وہ اپنی عمارتوں میں کوئی تراشا ہوا پتھر لگانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ عمارتوں میں تراشے ہوئے پتھر لگانا قوم کے اندر تن آسانی

اور تعیش پسندی کے رجحان کی دلیل ہے۔ اسی طرح اپنی آیندہ نسلوں کی صحت مندی کے معاملے میں، میں نے سنا ہے کہ وہ اس قدر حساس تھے کہ اس کے لیے انھوں نے بعض ظالمانہ طریقے بھی اختیار کر لیے تھے، مثلاً یہ کہ وہ کمزور بچوں کو سرے سے زندہ ہی نہیں رہنے دیتے تھے۔

ہمارے ہاں، یعنی اسلام میں، اولاد کی اصلاح و تربیت کا جو اہتمام رہا ہے، اس کے لیے دوسری چیزوں سے قطع نظر کر کے اگر صرف قرآن ہی پر نظر ڈال لیجیے تو اس کی اہمیت واضح کر دینے کے لیے وہ کافی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وصیت اپنی اولاد کو، حضرت اسحٰق و حضرت یعقوب علیہما السلام کی وصیت و نصیحت اپنی ذریت کو، حضرت لقمان کی تلقین اپنے بیٹے کو۔ یہ ساری سرگذشتیں اسی لیے بیان ہوئی ہیں کہ ہم ان سے یہ سبق حاصل کریں کہ اچھے اسلاف کے نام اور کام اچھے اخلاف ہی سے باقی رہتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی سرگذشت پڑھیے تو دل تڑپ تڑپ جاتا ہے کہ ان کو اپنے بیٹے کی نااہلی کا کتنا غم تھا اور انھوں نے اصلاح و تربیت کے لیے کیا کیا زحمتیں اٹھائیں اور کس کس طرح اپنے رب کے آگے آہ و فغاں کی۔

حضرات، یہ چیز بالکل فطرت انسانی ہے۔ افراد ہوں یا قومیں ان کا مادی اور معنوی وجود ان کے اخلاف ہی کے واسطے سے باقی رہتا ہے اور اس بقا کی خواہش ایک امر فطری ہے۔ جس قوم کے اندر یہ خواہش مردہ ہو جاتی ہے یا اس کے لیے جو اہتمام مطلوب ہے، وہ اس کے اندر باقی نہیں رہتا تو وہ قوم دنیا کے نقشے سے مٹ جاتی ہے۔

اس وجہ سے مبارک ہے وہ قوم جس کے ذمہ دار اجتماعی بقا کے اس رمز سے آشنا ہیں اور وہ آنے والی نسل کو ان عظیم ذمہ داریوں کے لیے تیار کر رہے ہیں جو ان کے کندھوں پر آنے والی ہیں۔ لیکن عزیز طلبہ اور طالبات، میں یہاں اجتماعیات کے ایک اور رمز سے بھی آپ کو آگاہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ مستقبل کی ذمہ داریاں بہر حال آپ کے کندھوں پر آنے والی ہیں اور مستقبل آپ کو اپنے باٹ اور اپنی ترازو سے تولے گا۔ وہ اس معاملے میں کسی رو رعایت اور کسی عذر و معذرت کے قبول کرنے کا روادار نہ ہو گا۔ اگر آپ اپنی ذمہ داریوں کے لیے نااہل ثابت ہوں گے تو وہ اس بنا پر آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا کہ آپ کے پچھلوں نے آپ کے معاملے میں اپنی ذمہ داریاں کماحقہٗ ادا نہیں کیں۔ انھوں نے ادا کیں یا نہیں کیں؟ یہ سوال خارج از بحث ہو جائے گا۔ کسوٹی پر آپ ہوں گے نہ کہ ہم! فیصلہ آپ کی اہلیت و نااہلیت کا ہو گا نہ کہ ہماری! جواب دہ آپ ہوں گے نہ کہ آج کے لوگ! اگر آپ نااہل ثابت ہوں گے تو زمانہ آپ کے خلاف بے لاگ فیصلہ سنا دے گا اور دنیا کے نقشے سے آپ کا وجود مٹ جائے گا:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَّهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ. (البقرہ۲:۱۳۴)

اگر آپ یہ محسوس بھی کرتے ہیں کہ آج آپ کے ذمہ دار آپ کے حق کو صحیح طور پر نہیں ادا کر رہے ہیں جب بھی آپ اپنے فرض کو پہچاننے کی کوشش کریں اور مستقبل میں اپنے بل بوتے پر اپنی بازی جیتنے کی تیاریاں کریں۔ لائق اولاد باپ کی کمزوریوں کو اپنی کمزوریوں کے لیے عذر نہیں بناتی، بلکہ اپنی محنت و قابلیت سے اپنا نام بھی روشن کرتی ہے اور باپ کا نام بھی۔

عزیز طلبہ و طالبات، اگر آپ میرا نقطۂ نظر اچھی طرح سمجھ گئے ہیں تو اب میں آگے بڑھتا ہوں اور یہ عرض کرتا ہوں کہ قوم کی خلافت و وراثت سنبھالنے کے لیے آپ کا مقدم فرض یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو ہر اعتبار سے صحت مند اور تندرست نسل بنانے کی کوشش کریں۔ ہر اعتبار سے صحت منداور تندرست بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جسمانی، عقلی اور ایمانی و اخلاقی تینوں ہی اعتبارات سے! جب تک ان تینوں ہی اعتبارات سے ہمارے نوجوان تندرست نہ ہوں، اس وقت تک نوجوانوں کے اندر قوت پیدا نہیں ہو سکتی اور جب تک ان کے اندر قوت نہ پیدا ہو، اس وقت تک وہ اس ملت کی خلافت و وراثت کے حامل ہونے کے اہل نہیں ہو سکتے جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی قوموں کی امامت کے منصب پر مامور فرمایا ہے۔ اب میں بالاختصار صحت کے ان تینوں پہلوؤں پر کچھ باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

## صحت جسمانی

جسمانی صحت کی اہمیت میرے نزدیک اس پہلو سے نہیں ہے کہ آپ کوئی بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے والے پہلوان یا گھونسہ باز بن جائیں۔ میں سانڈ اور کٹے کی صحت پر گفتگو نہیں کر رہا ہوں، بلکہ انسان کی صحت پر گفتگو کر رہا ہوں۔ انسان کے لیے صحت جسمانی کی اہمیت اس پہلو سے ہے کہ یہ چیز عقلی اور اخلاقی صحت کے لیے بمنزلہ بنیاد ہے۔ عقل کے نشوونما اور اعلیٰ ایمانی اور اخلاقی تقاضے پورے کرنے کے لیے جسمانی صحت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کمزور، مریض اور ناتواں جسم کے اندر عقل بھی مریض و ناتواں ہوتی ہے اور ضعیف الاعضا اور ضعیف القویٰ لوگ ایمانی و اخلاقی تقاضے بھی پورے کرنے میں ضعیف ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ لازم نہیں کہ جس کا جسم تندرست ہو، اس کی عقل اور اس کا اخلاق بھی تندرست ہو۔ بہت سے لوگ جسماً بڑے تندرست ہوتے ہیں، لیکن عقلی اور اخلاقی اعتبار سے بالکل احمق اور سفلہ ہوتے ہیں۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ عقلی و اخلاقی تندرستی کے لیے جسمانی تندرستی بھی ضروری ہے۔

میں کوئی طبیب یا ڈاکٹر نہیں ہوں۔ اور نہ میرے پیش نظر اس وقت صحت کے لوازم و شرائط پر کوئی خطبہ دینا ہے۔ میں ایک عام آدمی کی حیثیت سے جانتا ہوں کہ جسمانی صحت کے لیے چند چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کا اہتمام حتی الامکان ہر شخص کے لیے ضروری ہے:

۱۔ سادہ اور ستھری غذا۔

۲۔ تازہ اور صاف ہوا۔

۳۔ محنت اور ورزش۔

۴۔ ضبط نفس۔

جہاں تک سادہ اور ستھری غذا کا تعلق ہے، اس کا اہتمام اگر آپ کے لیے بہت آسان نہیں تو زیادہ مشکل بھی نہیں ہے، بشرطیکہ آپ غذائیات کے متعلق کچھ علم اور تجربہ حاصل کر لیں اور اس کے لیے کچھ زحمت اٹھانے اور کچھ اہتمام رکھنے کی اپنے اندر عادت پیدا کر لیں۔ آپ اس بات سے واقف ہوں گے کہ صحت کے لیے نہ بہت قیمتی غذا کی ضرورت ہے، نہ اس کے لیے تنوعات اور چٹخاروں کی احتیاج ہے۔ اگر آپ غیر ضروری اور مضر صحت چیزوں کا استعمال ترک کر دیں اور چٹخاروں کے درپے نہ ہوں تو آپ میں سے ہر شخص اگر نہیں تو اکثر لوگ بہ آسانی اپنے لیے صاف ستھری غذا کا اہتمام کر سکتے ہیں اور اگر آپ سادہ غذا اور سادہ لباس کو جماعتی حیثیت سے اختیار کرنے کا اپنے اندر ولولہ پیدا کریں تو آپ اس کو فیشن کی حیثیت بھی دے سکتے ہیں اور اس سے ہر شخص کی مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم کھانا تو مغلوں کے دور زوال کا پسند کرتے ہیں اور لباس انگریزوں اور فرانسیسیوں کے دور زوال کا! ہماری یہ زوال پسندی ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ آپ لوگوں نے تو تاریخ پڑھی ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ مغلوں نے ایوان نعمت کے یہ دستر خوان جس وقت بچھائے ہیں، یہ تاریخ کا وہ منحوس دور ہے جب انھیں دلی کا لال قلعہ انگریزوں کے لیے خالی کر دینا پڑا۔ اس دستر خوان کے ساتھ ان کی حکومت کی بساط بھی الٹ گئی۔ جس دور میں انھوں نے یہ تمام ممالک فتح کیے ہیں، اس دور میں وہ ان لذات سے ناآشنا تھے۔ اس زمانے میں تو ان کے نوجوانوں کا یہ حال تھا کہ وہ خشک گوشت کے ٹکڑے اپنے گھوڑے کی زین کے نیچے رکھ لیتے۔ جب وہ گھوڑے کے پسینے سے کچھ نرم ہو جاتے تو جہاں بھوک لگتی، اس کو چاب لیتے۔ اس غذا نے ان کے اندر یہ طاقت پیدا کی کہ جدھر کا انھوں نے رخ کیا، ادھر کی دنیا الٹ دی۔ کم و بیش یہی حال انگریزوں کا بھی رہا ہے۔ جس دور میں انھوں نے تمام دنیا کو زیر نگیں کیا ہے، ان کے نوجوانوں کی سخت جانی و سخت کوشی مثالی رہی ہے۔ یہ دور تو ان کے زوال کا دور ہے اور یہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اس کو ان کی ترقی کا دور سمجھتے ہیں۔

صاف ستھری ہوا کے لیے آپ صبح خیزی کی عادت پیدا کیجیے۔ صبح خیزی کی عادت ہمیشہ سے بیدار بخت لوگوں کی عادت رہی ہے۔ آپ کو علامہ اقبال کا وہ شعر یاد ہو گا جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ جس سحر سے شبستان وجود لرزتا ہے وہ طلوع آفتاب سے نہیں پیدا ہوتی، بلکہ مومن کی اذان سے پیدا ہوتی ہے! اس اذان سے دنیا کو آپ ہی نے آشنا کیا، لیکن اب آپ خود اس کی لذتوں سے ناآشنا ہو گئے۔ سویرے اٹھیے، دوسروں کو خواب غفلت سے جگائیے۔ خالق کائنات کی بندگی کیجیے۔ اور پھر کھلے میدانوں اور چمنستانوں میں، جن کی آپ کے اس شہر میں کمی نہیں ہے، سیر کیجیے اور تازہ ہوا کا لطف اٹھائیے۔

ورزش اور محنت کا مقصود اپنے آپ کو سخت کوش اور سخت جان بنانا ہے تاکہ آپ چاق و چوبند رہیں، سردی اور گرمی کو برداشت کر سکیں، بھوک اور پیاس کا مقابلہ کر سکیں اور وقت پڑنے پر سخت سے سخت مشقت جھیل سکیں۔ بہترین ورزش وہ ہے جو آدمی کو میدان جنگ کی سختیوں کے لیے تیار کرے۔ ہمارے اسلاف میں اسی قسم کی ورزش کا ذوق و شوق تھا۔ آپ بھی اپنے اندر اس کا شوق پیدا کیجیے۔ نزاکت عورتوں کے لیے حسن ہے، لیکن نوجوانوں کے لیے اس سے بڑا کوئی عیب نہیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ضبط نفس، صحت کے نہایت اہم لوازم میں سے ہے۔ جب تک آپ اپنی خواہشات، اپنے جذبات اور اپنی شہوات پر کنٹرول کرنا نہیں سیکھیں گے، اس وقت تک ان تمام تدبیروں کے باوجود بھی، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، آپ حقیقی صحت نہیں حاصل کر سکیں گے۔ اس زمانے میں ایسے نوجوان بہت کم نظر آتے ہیں جن کے چہروں پر فتوت کا جمال نظر آتا ہو۔ معاف کیجیے گا میں آپ پر کوئی طعن نہیں کر رہا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں نوجوانوں کو دیکھیے تو عام طور پر چہرے کملائے ہوئے اور آنکھیں دھنسی ہوئی، رنگ اڑے ہوئے، گال پچکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ اس زمانے میں غذا خالص نہیں مل رہی ہے، بلکہ اس میں بڑا دخل ہے نگاہ کی آوارگی، دل کی ہرزہ گری اور جذبات و خواہشات کی بے راہ روی کو اور یہ چیزیں وہ ہیں جو نہ صرف غارت گرِ اخلاق و دین و ایمان ہیں، بلکہ غارت گرِ حسن و صحت بھی ہیں۔ آپ اگر اپنے جذبات و خواہشات کو ضبط میں رکھنا سیکھ جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ نان جویں کھا کر بھی آپ کے چہروں پر اس جمال فتوت کا عکس نظر آئے گا جو علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے چہرے پر تھا۔

حضرات، میں جس جمال کا ذکر کر رہا ہوں، اس کا تعلق جسم کی جلد اور اس کے رنگ و روغن سے نہیں ہے، بلکہ اس

کا منبع باطن کی صحت ہے۔ جس کے باطن میں صحت ہوتی ہے، وہ ضابطِ نفس ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کے لیے 'حصور' کا لفظ آیا ہے۔ اس صفت کے مدارج و مراتب ہیں، لیکن باطن میں یہ نور اسی صفت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ نور حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی وراثت ہے۔ جس کے اندر اس نور کی کوئی جھلک ہوگی، اس کی چمک اس کی پیشانی کے افق پر نظر آئے گی اور خوش قسمت ہے وہ نوجوان جو اس جمال یوسفی میں سے کوئی حصہ پائے۔ جن پیشانیوں پر اس جمال کی کوئی کرن ہوتی ہے، اگر ان کا رنگ کالا بھی ہو تو وہ رشک آفتاب و ماہتاب ہوتی ہیں۔

حضرات، اصلی روحانی طاقت کا خزانہ بھی اسی ضبطِ نفس کے اندر ہے۔ جو اپنے نفس سے شکست کھا جاتا ہے، وہ ہر ایک سے مار کھا جاتا ہے۔ برعکس اس کے جو اپنے نفس پر فتح پا جاتا ہے، وہ ہر میدان میں شیطان کو زیر رکھتا ہے۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم میں پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسروں کو پچھاڑ لے، بلکہ اصلی پہلوان وہ ہے جو اپنے نفس کو پچھاڑ لے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

## صحت عقلی

حضرات، عقلی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ ماضی و حاضر کے عقلی و فکری اندوختوں سے فائدہ اٹھائیں اور پھر اپنی عقل کو کام میں لا کر اس اندوختہ میں اگر کچھ اضافہ کر سکیں تو اضافہ کریں۔ انسانیت کا اصل خزانہ درحقیقت یہی عقلی و فکری خزانے ہیں۔ اسی کے تحفظ، بقا اور ترقی کے لیے یہ کالج، یونیورسٹیاں، لائبریریاں اور لیبارٹریاں قائم ہیں اور آپ درحقیقت اسی لیے اس جامعہ میں جمع ہوئے ہیں کہ آپ اپنی عقل کو درست کریں۔

عقل انسان کے اندر خدا کا بخشا ہوا نور ہے۔ یہی چیز انسان کو حیوان سے ممیّز کرتی ہے۔ دنیا میں ساری بہار اسی کی لائی ہوئی ہے۔ انسانیت کے گل سرسبد وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی عقلوں کو استعمال کیا، اس لیے کہ آج انسانیت کے اندوختہ میں جو کچھ بھی ہے، انھی کا عطیہ ہے۔

ان دانش وروں اور عاقلوں کی کوشش سے ہمارے علوم میں اب اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ کسی ایک انسان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ ان سب کا احاطہ کر سکے۔ اگر آپ اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ کسی ایک فن میں آپ کمال حاصل کر لیں۔ میرے نزدیک آج علم میں ادنیٰ درجہ یہی ہے کہ آپ کسی ایک فن میں کمال حاصل کر لیں اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ اس فن میں درجۂ کمال سے آگے بڑھ کر درجۂ اجتہاد حاصل کر لیں تاکہ آپ اس فن پر کچھ اضافہ کر کے اپنے بعد والوں کے لیے کوئی علمی وراثت چھوڑ سکیں۔ دنیا ہر لمحہ ترقی کی طرف جا

رہی ہے۔اس کی ہم قدمی کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان اس علمی وعقلی جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہ رہیں، ورنہ انھیں ہر میدان میں پیچھے رہنا پڑے گا۔

اگر آپ میری اس بات کی اہمیت اچھی طرح سمجھ گئے ہیں تو لازم ہے کہ آپ دو باتوں کا اہتمام کریں:

ایک اس بات کا کہ آپ اپنے اوقات کا لمحہ لمحہ اعلیٰ قدر و قیمت رکھنے والی علمی و فنی چیزوں کے مطالعہ پر صرف کریں۔ادنیٰ درجے کی چیزوں پر اپنا وقت ضائع کرنا اپنے اوپر حرام قرار دے لیں۔تیسرے درجہ کی چیزیں تو درکنار، دوسرے درجے کی چیزیں بھی آپ کے لیے اضاعت وقت کے حکم میں داخل ہیں۔اس زمانے کے نوجوانوں کو جب میں سرسری، سطحی، عامیانہ اور مزخرف چیزیں پڑھتے دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ناقص اور بے مغز چیزیں پڑھنا فاسد اور مسموم غذا سے زیادہ انسان کے لیے مہلک ہے۔اس زمانے میں پریس کی سہولت نے جس طرح علوم کے انبار لگا دیے ہیں، اسی طرح خرافات کے بھی انبار لگا دیے ہیں اور بدقسمتی سے ہمارے نوجوان اسی دوسری قسم کے انبار سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔اس پر مزید ستم یہ ہے کہ اس زمانے میں وہ لٹریچر بھی بہت بڑی مقدار میں شائع ہو رہا ہے جو مولانا حالی رحمہ اللہ کے الفاظ میں 'عفونت کے لحاظ سے سنڈاس سے بھی بدتر ہے'۔اس قسم کی چیزیں کسی قوم کے نوجوان اس زمانے میں پڑھتے ہیں جب اس قوم کی موت کا وقت قریب ہوتا ہے۔آپ اپنی قوم کے لیے موت کے بجائے زندگی کے پیام بر بنیں۔اس معاملے میں آپ یورپ اور امریکا کی قوموں کی ریس نہ کریں۔قومی عروج و زوال کے فلسفہ کی رو سے اب ان قوموں کا دم واپسیں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوسری اس بات کا اہتمام آپ کے لیے ضروری ہے کہ اس فکری وعقلی تربیت کے دور میں آپ اپنے دائرہ کے باہر کے سیاسی معاملات ومسائل میں عملاً کوئی حصہ نہ لیں۔اس دور میں آپ ان میں عملاً کوئی حصہ لینے کے بجائے ان میں حصہ لینے کی اپنے اندر پختہ قابلیت پیدا کریں۔کل ساری ذمہ داریاں آپ کے سر پر آنے والی ہیں۔آپ ہی یونیورسٹیوں اور کالجوں کو سنبھالیں گے۔آپ ہی اخباروں کے ذمہ دار ہوں گے۔آپ ہی عدالتوں اور کچہریوں میں ہوں گے۔آپ ہی قوم کے لیڈر، اسمبلیوں کے ممبر، صوبوں کے گورنر، ملک کے وزیر، ملک کے صدر اور باہر کے ملکوں میں ملک کے نمایندہ اور سفیر ہوں گے۔اونچی سے اونچی کرسی پر آپ ہی بیٹھیں گے اور ملک وقوم کی باگ آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ان ذمہ داریوں کے لیے آپ اپنے آپ کو تیار کریں۔یہ تیاری کوئی آسان کام نہیں ہے کہ آج آپ کو پرائے جھگڑوں میں ٹانگ اڑانے کا موقع مل سکے۔آپ کو کوئی غلط فہمی نہ ہو۔میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ سیاست میں کوئی حصہ ہی نہ لیں۔ضرور حصہ لیں، لیکن یہ حصہ لینا فکری ونظری نوعیت کا ہو۔آپ اپنے ملک کے معاملات و

مسائل کو اچھی طرح سمجھیں۔ ان کے حل سوچیں اور ان کے لیے اپنے کو تیار کریں، لیکن ان میں عملی مداخلت نہ کریں۔ خام کاروں کی مداخلت معاملات کو سنوارتی نہیں بلکہ بگاڑتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ 'بعض لوگ پکنے سے پہلے سڑ جایا کرتے ہیں'۔ غالباً ان کا اشارہ ایسے ہی لوگوں کی طرف رہا ہوگا جو قبل از وقت اپنے آپ کو رموز مملکت کا ماہر سمجھنے لگتے ہیں اور قوم کے معاملات کو حل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ پکنے سے پہلے سڑنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

## ایمانی و اخلاقی صحت

عزیز طلبہ و طالبات، اب میں چند باتیں ایمانی و اخلاقی صحت سے متعلق عرض کروں گا۔

سب سے پہلے اس بات کو یاد رکھیے کہ ایمانی و اخلاقی صحت عقلی صحت سے کوئی علیحدہ شے نہیں ہے، بلکہ یہ اسی کا تکملہ اور تتمہ ہے۔ جس طرح عقل، انسانیت کا نور ہے، اسی طرح ایمان عقل کا نور ہے۔ جس طرح انسان کو حیوان سے ممیّز کرنے کے لیے خدا نے عقل عطا فرمائی ہے، اسی طرح عقل کو جلا دینے کے لیے خدا نے ایمان کی روشنی عطا فرمائی ہے۔ عقل بڑی نعمت ہے، لیکن اس میں یہ نقص بھی ہے کہ وہ بسا اوقات اسی دنیا کی فانی اور محدود لذتوں اور کاوشوں میں گھر کے رہ جاتی ہے جس کے سبب سے وہ ان حقائق کو نہیں دیکھ پاتی جن پر انسانی زندگی کی ابدیت کی بنیادیں ہیں۔ یہ کوتاہی ایک بڑی خطرناک کوتاہی ہے۔ اس کے سبب سے انسان کا زاویۂ نگاہ بہت تنگ، اس کے حوصلے بہت پست، اس کی چاہتیں بالکل مادی اور سفلی اور اس کی اخلاقی اقدار بالکل خود غرضانہ اور مفاد پرستانہ ہو کے رہ جاتی ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عقل انسانی کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی کا نور بھیجا ہے جو دنیا کو حضرات انبیا علیہم السلام کے ذریعہ سے ملا ہے۔ یہ نور عقل انسانی کی رہنمائی ابدیت کی منزلوں کی طرف کرتا ہے اور اس کو اس معراج پر پہنچاتا ہے جہاں فرش اور عرش، دونوں کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ یہاں انسان اپنی حقیقی قدر و قیمت سے آشنا ہوتا ہے۔ اس پر یہ راز کھلتا ہے کہ وہ ایک ابدی وجود رکھتا ہے۔ اس کو یہاں مرنے کے بعد پھر جینا بھی ہے۔ اس کے اقوال، اعمال اور عقائد، سب ایک ابدی قدر و قیمت رکھتے ہیں، اس وجہ سے اسے ان کو اسی دنیا کے نفع و ضرر کے محدود پیمانوں سے نہیں ناپنا تولنا چاہیے، بلکہ مرنے کے بعد کی زندگی کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ اسے اسی حیات چند روزہ کے لیے نہیں جمع کرنا چاہیے، بلکہ اصلی فکر اس حیات ابدی کے لیے ہونی چاہیے جو شروع ہو کر کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔

حضرات، اس وحی الٰہی کا آخری اور کامل صحیفہ قرآن مجید ہے جس کا نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ اور جس کو لانے

والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس وجہ سے آپ کو اپنی روحانی و ایمانی صحت کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ ان سے روشنی حاصل کیے بغیر نہ آپ کی عقل اس عالم فانی کی تنگ نائے سے باہر نکل سکتی، نہ آپ کے اخلاق و کردار میں آفاقیت وابدیت پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ آپ صرف دنیا کی قوموں میں سے ایک قوم نہیں ہیں جس کو جغرافیہ کی حد بندیوں نے پیدا کیا ہو، بلکہ آپ خلافت الٰہی کے وارث، خیر امت اور زمین میں خدا کے قانون عدل وقسط کے علم بردار اور گواہ ہیں۔ آپ قوموں کے مقلد یا ان کے حریف نہیں، بلکہ اپنے منصب کے لحاظ سے ان کے ہادی و مرشد ہیں۔ آپ کو صرف اپنے ہی لیے نہیں جینا ہے، بلکہ اس پوری خدائی کے لیے جینا ہے۔ آپ کی دنیا اسی عالم آب وگل تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ایک ناپیدا کنار عالم ـــــ آخرت کا عالم بھی جڑا ہوا ہے۔ اس وجہ سے وہ محدود نگاہ جو ابھی تک چاند و مریخ تک بھی نہ پہنچ سکی، آپ کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ آپ نے دنیا کو عرش کا بھی سراغ دینا ہے۔ اسی طرح وہ کردار جو نسلی و قومی تعصّبات کے خمیر سے پیدا ہوتا ہے، وہ آپ کے شایان شان نہیں ہے، بلکہ وہ کردار آپ کا حصہ ہے جس پر صفات الٰہی کا عکس اور نور محمدی کا جمال ہو۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسی کتاب وسنت کے تعلق اور فیض سے ہمارے نوجوانوں کے اندر وہ فتوت پیدا ہوگی جو علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اندر تھی۔ ہم مسلمانوں میں بوڑھوں کے لیے نمونہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں جن کو 'ذو شیبة المسلمین' (مسلمانوں کے بڑے بوڑھے) کہا جاتا تھا۔ ادھیڑوں کے لیے مثال فاروق اعظم اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم ہیں۔ دونوں غازی، دونوں فاتح، دونوں شہید اور دونوں خدا کی زمین میں خدا کے قانون عدل وقسط اور حکومت الٰہیہ کے مظہر! اسی طرح نوجوانوں کے لیے مثال اور نمونہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں! جن کی بابت آپ نے سنا ہوگا کہ 'لافتیٰ إلّا علی لا سیف إلّا ذو الفقار'۔ اور ہاں، عزیز طالبات، آپ بھی سن لیں کہ آپ کے لیے مثال عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ جن کے علم وعقل کا یہ عالم تھا کہ ان کی روایات اور ان کے اجتہادات پر ہماری فقہ کی بنیادیں استوار ہوئیں اور جن کے زہد و تقویٰ اور طہارت کی شہادت قرآن مجید نے دی۔

عزیز نوجوانو، آپ اپنے اندر یہ فتوت پیدا کیجیے۔ یہ فتوت صرف جسمانی بلوغ، خون کے ہیجان، رگ پٹھوں کی قوت اور مرغن غذاؤں سے نہیں پیدا ہوتی، بلکہ ضبط نفس، عقلی صحت اور ایمانی واخلاقی تندرستی سے پیدا ہوتی ہے۔

ہماری قوم کو آج سب سے زیادہ ضرورت اسی چیز کی ہے۔ ہم آج اپنے ملک میں جن چیزوں کی کمی سے دوچار ہیں، یہ ساری کمیاں پوری ہو جائیں گی، لیکن جو اخلاقی زوال ہمارے ہر طبقے میں عموماً اور نوجوانوں کے طبقے میں

خصوصاً نمایاں ہو رہا ہے۔ یہ وہ مرض ہے جو اگر جڑ پکڑ گیا تو اس کا علاج ناممکن ہو گا۔ ہمارا حاضر جیسا کچھ بھی ہے، لیکن مستقبل کا انحصار تمام تر آپ کی صلاحیتوں پر ہے۔ میری دعا ہے کہ میری یہ معروضات آپ کے دل میں گھر کریں۔ آپ اپنے فرض کو پہچانیں اور آپ کے روز و شب، آپ کے اشغال و معمولات اور آپ کے ظاہر و باطن میں وہ تبدیلی نمایاں ہو جو آپ کے دعا گووں اور آپ سے امیدیں باندھنے والوں کو ایک روشن مستقبل کی بشارت دے۔

(ماہنامہ میثاق لاہور-اپریل ۱۹۶۷ء، بہ حوالہ مقالات اصلاحی ۳۶۵/۲)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد عمار خان ناصر

# دولت اسلامیہ اور قیام خلافت: ایک سنگین مغالطہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دولت اسلامیہ (داعش) کے وابستگان کا یہ کہنا ہے کہ اس کے سربراہ اس وقت شرعی لحاظ سے سارے عالم اسلام کے ''خلیفہ'' کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی اطاعت قبول کرنا تمام مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے۔ اس ضمن میں ان حضرات کی طرف سے پیش کردہ استدلال کے مقدمات حسب ذیل ہیں:

۱۔ خلافت کا قیام مسلمانوں پر فرض ہے اور اس کا اہتمام نہ کرنے کی صورت میں ساری امت گناہ گار قرار پاتی ہے۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد سے اب تک عالم اسلام اس فریضے کا تارک تھا، لیکن اب دولت اسلامیہ کی صورت میں اس فریضے کی ادائیگی کا اہتمام کر دیا گیا ہے، اس لیے اس کی اطاعت قبول کرنا مسلمانوں پر شرعاً لازم ہے۔

۲۔ اس خلافت کا قیام شرعی اصول کے تحت، یعنی ارباب حل وعقد (جس سے مراد عراق وشام کی جہادی تنظیموں کے ذمہ داران ہیں) کے مشورے سے ہوا ہے اور ان کی بیعت، خلافت کے انعقاد کے لیے کافی ہے، کیونکہ فقہا کی تصریح کے مطابق ''خلیفہ'' کے انتخاب پر سارے عالم اسلام کے ارباب حل وعقد کا اتفاق نہ ضروری ہے اور نہ عملاً ممکن ہے۔

۳۔ بالفرض یہ کہا جائے کہ دولت اسلامیہ مشورے کے بجائے طاقت کے زور پر قائم ہوئی ہے تو بھی تغلب اور تسلط کے ذریعے سے قائم ہونے والی حکومت جب اپنی رٹ قائم کر لے اور لوگ اس کی بیعت کر لیں تو شرعی طور پر اس کا اقتدار قائم ہو جاتا اور اس کی اطاعت لازم ٹھہرتی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ سارا استدلال سرتاسر کج فہمی اور مغالطوں پر مبنی ہے۔ آیئے، اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔

پہلے نکتے کو دیکھیے:

فقہا نے جس مفہوم میں خلافت کے قیام کو فرض قرار دیا ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے اجتماعی معاملات کی انجام دہی کے لیے ایک باقاعدہ نظام حکومت قائم کریں اور اس کے تحت زندگی بسر کریں، کیونکہ شریعت نے بحیثیت جماعت مسلمانوں کو جو احکام دیے ہیں، ان میں سے بہت سے احکام پر عمل درآمد قیام حکومت پر موقوف ہے، جبکہ افراد اپنی انفرادی حیثیت میں ان پر عمل نہیں کر سکتے۔ اس وجہ سے اگر مسلمان کسی علاقے میں آزاد اور خود مختار ہوں اور اس کے باوجود اپنا کوئی نظم اجتماعی قائم نہ کریں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی میں شریعت کے بہت سے احکام پر عمل نہیں کر سکیں گے اور یوں ایک شرعی فریضے کے تارک اور گناہ گار قرار پائیں گے۔ فقہا اسی کو ''نصب امام'' کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی مسلمانوں پر اپنا کوئی حکمران منتخب کرنا لازم ہے جو ان کے اجتماعی معاملات کی انجام دہی کی ذمہ داری ادا کر سکے۔

اگر کسی علاقے کے مسلمان اس کا اہتمام کر لیں تو وہ اس فرض کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں اور انھیں شریعت کے ایک فرض کا تارک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ حکمرانی کے لیے کسی نا اہل کا انتخاب کر لیں یا کوئی نا اہل از خود طاقت کے زور پر ان پر مسلط ہو جائے یا ارباب اقتدار اپنے اوپر عائد ہونے والی شرعی ذمہ داریوں کو کماحقہٗ انجام نہ دیں، لیکن ان سب خامیوں کے باوجود اگر مسلمانوں نے اپنا کوئی نظم حکومت قائم کر لیا ہو اور وہ ایک منظّم گروہ کے طور پر زندگی بسر کر رہے ہوں تو فقہا کے زاویۂ نظر سے ان پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ ''نصب امام'' کے شرعی فریضے کے تارک اور گناہ گار ہیں۔ وہ حسب استطاعت نظام حکومت کی اصلاح کے لیے کوشش اور جدوجہد کے تو مکلّف ہوں گے، لیکن شریعت اس صورت حال میں انھیں اس بات کا مجرم قرار نہیں دیتی کہ انھوں نے اصل حکم، یعنی ''نصب امام'' پر ہی عمل نہیں کیا۔

عصر حاضر کے معروف فقیہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے اس نکتے کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

''تمام فقہاء اور اہل عقائد اس بات پر متفق ہیں کہ امام کا نصب کرنا مسلمانوں پر واجب ہے، یعنی مسلمانوں کی پوری جماعت کے ذمہ واجب ہے کہ وہ کسی کو اپنا امام بنائیں، ایسے شخص کو امام بنائیں جو ان صفات کا حامل ہو جس کا حاصل یہ ہے کہ نصب الامام ایک طرح سے فرض کفایہ ہوا۔ لیکن یہاں یہ فرق سمجھ لیجیے کہ نصب الامام کا واجب ہونا، اس کا تعلق اس حالت سے ہے جب مسلمانوں کا کوئی سربراہ نہ ہو، یعنی مسلمان بغیر کسی سربراہ کے زندگی گزار رہے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہوں۔ کوئی ان کا حاکم نہ ہو، کوئی ان کا سربراہ نہ ہو۔ اس وقت میں مسلمانوں میں سے کسی ایک کو امام بنانا واجب ہے۔ لیکن اگر کوئی ان کا سربراہ بنا ہوا ہے، خواہ زبردستی یا تغلب سے بنا ہو، اور وہ امام صفات مطلوبہ کا حامل نہ ہو، جیسا کہ اس وقت اسلامی ممالک میں سربراہ موجود ہیں لیکن وہ ان صفات کے حامل نہیں ہیں جو سربراہ کے لیے مطلوب ہیں تو اس وقت میں مسلمانوں کا کیا کام ہونا چاہیے؟ اس کا تعلق اس مسئلے سے ہے کہ موجودہ سربراہ کو معزول کر کے کسی صحیح سربراہ کو لانے کا کیا طریق کار ہونا چاہیے۔'' (اسلام اور سیاسی نظریات ۲۲۶)

اس وضاحت کی روشنی میں دولت اسلامیہ کے اس دعوے کا جائزہ لیجیے کہ ''دولت اسلامیہ کے قیام سے پہلے تک پورا عالم اسلام ''نصب امام'' کے فریضے کا اجتماعی طور پر تارک تھا''، تو صاف معلوم ہوگا کہ اس میں ایک حقیقت واقعہ کی نفی کی جا رہی ہے، اس لیے کہ عالم اسلام کا کوئی بھی خطہ ایسا نہیں جہاں مسلمان اپنے آزاد علاقوں میں ''نصب امام'' یعنی کسی نظم اجتماعی کے قیام کے بغیر زندگی بسر کر رہے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اس دعوے کا جواز پیدا کرنے کے لیے ان حضرات کو اس کے ساتھ ایک دوسرا مقدمہ شامل کرنا پڑتا ہے، یعنی یہ کہ اس وقت پورے عالم اسلام میں کہیں بھی کوئی جائز شرعی حکومت موجود نہیں، کیونکہ تمام مسلمان حکمران فلاں اور فلاں وجوہ سے کافر اور مرتد ہو چکے ہیں۔ اس دوسرے دعوے کا الگ سے جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ یہاں صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ فقہا کی سند پر یہ دعویٰ کرنا کہ مسلمانوں کی اکثریت اس وقت ایک بنیادی شرعی فریضے، یعنی نصب امام کی تارک ہے، فقہا کے نقطۂ نظر کی بالکل غلط ترجمانی ہے اور اس کی کوئی علمی یا شرعی بنیاد موجود نہیں۔

دوسرے اور تیسرے نکتے کے متعلق گزارش یہ ہے کہ علما و فقہا جب انعقاد خلافت کے لیے بعض ارباب حل وعقد کے اتفاق کو کافی تصور کرتے اور سب کے اتفاق و اجماع کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں یا غلبہ وتسلط کے ذریعے سے قائم ہونے والی حکومت کو بالفعل ایک قانونی حکومت کا درجہ دیتے ہیں تو ان کے پیش نظر اس اصول کا اطلاق کسی مخصوص مسلم ریاست یا سلطنت کے عملی دائرۂ اختیار کے اندر ہوتا ہے نہ کہ علی الاطلاق سارے عالم اسلام کے مسلمانوں پر۔ اگر عالم اسلام کے سارے مسلمان، بالفرض، کسی وقت ایک ہی مرکزی حکومت کے تحت مجتمع ہوں تو فقہا کے بیان کردہ مذکورہ اصول کا دائرۂ اطلاق سارا عالم اسلام ہوگا، لیکن اگر کسی وقت سیاسی حالات اس سے مختلف ہوں اور مسلمان مختلف علاقوں میں اپنی اپنی جداگانہ حکومتیں قائم کر کے ان کے تحت زندگی بسر کر رہے ہوں تو پھر اس اصول کا اطلاق ہر حکومت یا سلطنت کے اپنے مخصوص دائرۂ اختیار اور اس کی عمل داری میں واقع علاقوں کے اندر ہوگا۔

ہم جانتے ہیں کہ اسلامی تاریخ کے ایک مخصوص مرحلے پر جب اندلس میں مسلمانوں کی ایک مستقل خلافت قائم

ہوگئی جس کا مرکزی خلافت کے ساتھ کوئی سیاسی تعلق نہیں تھا تو اس کے بعد اہل اندلس نے حکمرانی کے تسلسل اور انتقال اقتدار کے لیے اپنا سیاسی نظام بھی الگ وضع کیا اور اس علاقے کے مسلمان آیندہ تاریخ میں مرکزی خلافت سے آزادرہ کر اپنے سیاسی معاملات کی انجام دہی کرتے رہے۔ تاریخ اسلام میں اندلس کے فقہانے کبھی یہ سوال نہیں اٹھایا کہ جب بغداد میں ایک خلیفہ پہلے سے موجود ہے تو اس سے ہٹ کر اندلس میں ایک دوسرا خلیفہ کیوں حکومت کر رہا ہے؟ دونوں حکومتوں کے اپنے اپنے دارالحکومت اور اپنے اپنے ارباب حل وعقد تھے اور دونوں سلطنتوں میں خلیفہ کے انتخاب کے لیے مقامی ارباب حل وعقد کا اتفاق اسی علاقے کے لیے اور انھی جغرافیائی حدود میں موثر مانا جاتا تھا جن میں ان میں سے ہر ایک سلطنت عملاً قائم تھی۔ تاریخ میں کسی بھی مرحلے پر یہ بحث نہیں اٹھائی گئی کہ بغداد کے ارباب حل وعقد نے جس خلیفہ کے انتخاب پر صاد کیا ہے، اندلس کے مسلمان بھی اسی کی اطاعت قبول کرنے کے پابند ہیں یا اس کے برعکس یہ کہ اندلس میں ارباب حل وعقد نے جس حکمران کی بیعت کر لی ہے، باقی عالم اسلام کے مسلمانوں پر بھی اسی کی بیعت کرنا واجب ہے۔

یہی معاملہ عالم اسلام کے ان دوسرے خطوں کا بھی رہا ہے جہاں تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں نے مرکزی خلافت سے الگ اپنا نظام حکمرانی قائم کیا۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں مختلف مسلمان حکمرانوں کے جواز حکمرانی کو کبھی مرکزی خلافت کے ساتھ وابستہ نہیں کیا گیا اور نہ یہ تصور ہی پیش کیا گیا کہ ہندوستان کی مسلم حکومتوں کو لازمی طور پر بغداد کی مرکزی حکومت کے تابع ہونا چاہیے یا یہاں کے حکمران کا تقرر مرکزی خلافت کی طرف سے کیا جانا چاہیے۔ یہاں یکے بعد دیگرے مختلف مسلمان خاندان آتے رہے اور اپنے زور بازو سے جو بھی اپنا اقتدار جن زمینی حدود میں قائم کرنے میں اور مقامی ارباب حل وعقد کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، اس کی حکمرانی کو قبول کر لیا گیا۔ یہی صورت حال ہمیں عالم اسلام کے دور دراز خطوں، مثلاً انڈونیشیا اور ملائشیا وغیرہ کی تاریخ میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

اس سے واضح ہے کہ فقہا جب ایک علاقے کے ارباب حل وعقد کے اتفاق یا طاقت کے زور پر اپنا تسلط قائم کر لینے کی بنیاد پر کسی حکمران کی حکومت کو منعقد قرار دیتے ہیں اور اس کے لیے تمام علاقوں کے ارباب حل وعقد کے اتفاق کو ضروری قرار نہیں دیتے تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ کوئی مسلم ریاست یا سلطنت جن جغرافیائی حدود میں قائم ہے، ان کے اندر یہ فیصلہ نافذ تصور کیا جائے گا اور مرکز حکومت یا دارالخلافہ میں موجود ارباب حل وعقد جس حکمران کے انتخاب پر متفق ہو جائیں، اس کی اطاعت اس سلطنت کے دائرۂ اختیار اور زمینی حدود میں بسنے والے



www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مسلمانوں پر لازم ہو جائے گی۔ اس اصول کو مذکورہ قید سے آزاد کرتے ہوئے علی الاطلاق بیان کرنا نہ تو عقل عام کی رو سے درست ہے اور نہ یہ فقہا کی مراد اور منشا کی صحیح ترجمانی ہو گی، کیونکہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ خود مختار مسلم ریاستوں کے جواز کی نہ تو علما و فقہا نے عملاً کبھی نفی کی ہے اور نہ دو الگ الگ سلطنتوں کے سیاسی معاملات کو گڈ مڈ کرتے ہوئے ایک سلطنت کے سیاسی فیصلوں کی بنیاد پر دوسری سلطنت کے سیاسی معاملات میں مداخلت کو سند جواز دی ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں اب دیکھیے، یہ ایک حقیقت ہے کہ عالم اسلام اس وقت ساٹھ کے قریب الگ الگ اور خود مختار مسلم ریاستوں میں تقسیم ہے جن میں سے ہر ملک کے اپنے جغرافیائی حدود متعین ہیں اور ہر ملک کے باشندوں نے اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے اپنے سیاسی معاملات کی انجام دہی کا کوئی نہ کوئی نظام وضع کر رکھا ہے۔ یہ تمام مسلمان ملک باہمی معاہدات میں بندھے ہوئے ہیں جن کی رو سے ہر ملک کے ارباب حل وعقد جو بھی فیصلے کرتے ہیں، ان کا تعلق اسی ملک کے معاملات سے ہوتا ہے اور کوئی بھی ملک اپنے سیاسی دائرۂ اختیار سے تجاوز کرتے ہوئے دوسرے ملک کے معاملات میں دخل اندازی کرنے یا ان پر اپنے سیاسی فیصلوں کی پابندی لازم کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس وجہ سے اگر عراق اور شام کے بعض علاقوں میں کسی جماعت نے مفروضہ طور پر وہاں کے ارباب حل وعقد کے مشورے سے یا طاقت کے زور پر اپنا تسلط قائم کر کے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا ہے، اسے بالفرض ایک جائز حکومت تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس کا قانونی جواز اور دائرۂ اختیار اس علاقے تک محدود ہے جہاں اس نے بالفعل اپنی رٹ قائم کر رکھی ہے۔ اس کی طرف سے یا اس کے وابستگان کی طرف سے عالم اسلام کے باقی مسلمانوں سے یہ مطالبہ کہ وہ اپنی اطاعت اسی کے ساتھ وابستہ کر لیں اور خاص طور پر یہ کہ ایسا کرنا ان کا شرعی اور دینی فریضہ ہے، کسی بھی شرعی یا قانونی یا اخلاقی اصول کی رو سے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

عالم اسلام کی سیاسی وحدت اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہے، لیکن اس کا راستہ یہ نہیں کہ موجودہ آزاد اور خود مختار مسلم حکومتوں کے جواز کی نفی کی جائے اور قدیم شہنشاہیت کے طریقے پر پورے عالم اسلام کو کسی ایک حکمران کے زیر حکمرانی متحد کرنے کی کوشش کی جائے۔ تاریخ و تہذیب کے ارتقا کے اس مرحلے پر ایسی کوششیں پتھر سے سر پھوڑنے کے مترادف تو ہوں گی ہی، اس کے ساتھ ساتھ عالم اسلام میں اتحاد و اتفاق کے بجائے افتراق و انتشار اور باہمی خانہ جنگی کی آگ بھڑکانے کا بھی اس سے بڑھ کر تیر بہدف نسخہ کوئی اور نہیں ہو گا۔

---

خورشید احمد ندیم

# سیکولرزم اور مذہب کی بحث

یہ اصطلاحیں ہیں جو گمراہ کرتی ہیں۔ میرا احساس ہے کہ اصطلاح ایک حجاب ہے جو فرد شناسی اور سماج شناسی کے راستے میں حائل ہو جاتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں سوشل میڈیا پہ نہیں ہوں۔ اِس کی باز گشت لیکن اِدھر اُدھر سے سنتا ہوں۔ برادران وجاہت مسعود اور سبوخ سید کی ویب سائٹس دیکھ لیتا ہوں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظریاتی محاذ پر کیا معرکہ آرائی ہے۔ کبھی کبھی گمان ہوتا ہے کہ اس ملک میں 'سیکولر' اور 'مذہبی' نام کی دو مخلوقات پائی جاتی ہیں جو ذہنی اور حیاتیاتی ترکیب ہی میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جب ان تحریروں کے بین السطور جھانکتا ہوں تو لگا ہے یہ گمان ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی بات کہہ رہے ہیں۔ یہ اصطلاحیں ہیں جو دونوں کو ملنے نہیں دیتیں۔ مجھے اس موقع پر انسان اور جن کا وہ دل چسپ فرق یاد آتا ہے جو سر سید اور پرویز صاحب نے بیان کیا ہے۔ انھیں یہ ماننے میں تامل ہے کہ جن انسانوں سے الگ کوئی مخلوق ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان اور جن دراصل ایک ہی مخلوق ہے۔ انس اسم صفت ہے جس سے مراد مہذب لوگ ہیں اور جن سے مراد وحشی، جنگلی اور غیر مہذب انسان ہیں۔ جنوں اور انسانوں کے اس فرق سے تو اتفاق مشکل ہے، لیکن پاکستان کے سیکولر اور مذہبی گروہوں کا فرق مجھے اسی نوعیت کا دکھائی دیتا ہے۔ ایک ہی جنس کے دو طبقات جو اصطلاحوں میں الجھ گئے۔

میرا خیال ہے یہ ابلاغ کی ایک مجبوری ہے۔ انسان اپنے خیالات موجود لغت اور اصطلاحوں ہی میں بیان کرتا ہے۔ الفاظ خیال کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتے۔ اصطلاحیں شاید وضع بھی اسی لیے ہوتی ہیں۔ سیکولرزم ایک

اصطلاح ہے۔ یہ ایک نظریہ بھی ہے۔ بعض اوقات، لوگ جب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زندگی کے فلاں فلاں معاملات، فی نفسہٖ مذہب کا موضوع نہیں ہیں، اس لیے انھیں مذہبی نہ بنایا جائے تو اس کے لیے سیکولر کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ ناقد اس کا مفہوم 'سیکولرزم' کے تناظر میں طے کرتے ہیں جو دراصل ایک نظریہ ہے۔

یہ مشکل نئی نہیں ہے۔ مسلم دنیا میں جہاں جہاں سماج، ریاست اور مذہب کا تعلق زیر بحث ہے، وہاں وہاں یہ قضیہ درپیش آیا۔ انڈونیشیا میں، مثال کے طور پر، اسی طرح ہوا جب ڈاکٹر نور خالص مجید نے یہی بات کہنے کی کوشش کی۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ دنیاوی معاملات بنیادی طور پر مذہبی نہیں ہوتے۔ یہ انسان کو ازل سے درپیش رہے ہیں۔ ان کے بارے میں انسانی تجربے اور عقل نے اس کی راہنمائی کی اور یہ ایک جاری عمل ہے۔ انھیں اسی حوالے سے سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے اپنے ان خیالات کو دو مذہبی تصورات پر استوار کیا۔ ایک 'توحید' اور دوسرا 'خلافت اللہ فی الارض'۔ ان کا خیال تھا کہ الہامی حیثیت صرف توحید کی ہے۔ غیر اللہ کو، جن میں انسان کے قائم کردہ ادارے شامل ہیں جیسے، ریاست، انھیں بھی الہامی حیثیت دینا، شرک ہے۔ انسان دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے۔ ان کے خیال میں اس منصب کا تقاضا ہے کہ اس کا تخلیقی جوہر ہمیشہ سامنے آتا رہے۔ اسے وہ 'سیکولرائزیشن' سے تعبیر کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک نعرے کی طرح اسے بیان کیا: 'اسلام: جی۔ اسلامی جماعت: نہیں'۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں جب انھوں نے یہ بات کہی تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کہا گیا کہ وہ سیکولرزم کے حامی ہیں۔ اس پر انھیں وضاحت کرنا پڑی کہ سیکولرائزیشن سے مراد انسان کی آزادی فکر کو یقینی بنانا ہے، سیکولرزم کی بطور نظریہ توثیق نہیں۔ انھوں نے اپنی تائید میں، مسیحی الٰہیات کے بڑے فاضل ہاروے کوکس (Harvey Cox) کی بیسٹ سیلر کتاب سیکولر سٹی (The Secular City) کا حوالہ دیا جس میں انھوں نے سیکولرزم اور سیکولرائزیشن کے فرق کو واضح کیا ہے۔ زیر بحث مسئلے میں اس کتاب اور مصنف کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ سیکولرزم کی اصطلاح نے مسیحیت کے پس منظر میں جنم لیا تھا۔ کوکس کے خیال میں سیکولرائزیشن ایک سماجی عمل ہے جس کے بہت سے پیرہن ہیں۔ ہر لبادے یا پیرہن کا تعلق ایک خطے کی سیاسی اور مذہبی تاریخ سے ہے۔ یہ دراصل آزادی فکر کی ترقی (liberating development) ہے۔ ان کے خیال میں یہ سیکولرزم سے بالکل مختلف عمل ہے جو ایک نیا مذہب ہے جس کے اپنے لگے بندھے اصول ہیں۔ نور خالص مجید کا کہنا ہے کہ جب وہ انڈونیشیا کے مسلم سماج کی سیکولرائزیشن کی بات کرتے ہیں تو ان کی مراد دنیاوی معاملات کو مذہبی تقدس سے آزاد کرنا (desacralization) ہے، معاشرے کو سیکولرسٹ بنانا نہیں۔ (علم کی دنیا میں مسلمان اور اسلامسٹ دو مختلف اصطلاحیں ہیں۔ اسی طرح سیکولر اور سیکولرسٹ

بھی الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں۔

سیکولرزم کو نیا مذہب کیوں کہا جاتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مذہب کی طرح کچھ نتائج فکر کو قبول کرنے پر اصرار کرتا ہے جن میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ جیسے وہ جمہوریت کی ایک خاص تعبیر 'لبرل ڈیموکریسی' کو ماننے پر مصر ہے۔ اگر کسی خطے کے لوگوں کی اکثریت اس پر متفق ہو جائے کہ وہ ریاست کے قوانین کو مذہب کی روشنی میں ترتیب دیں گے تو وہ اس جمہوریت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ اگر پارلیمنٹ یہ فیصلہ کر دے کہ عوامی مقامات پر شراب نوشی منع ہے تو وہ مذہبی گروہوں کی طرح پارلیمنٹ کے اس حق کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے خیال میں یہ انسانی حقوق کے اس تصور سے متصادم ہے جسے وہ درست سمجھتے ہیں۔ یہی رویہ مذہبی طبقات کا بھی ہوتا ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ حقوق نسواں قانون کو مسترد کر دیتے ہیں جو ان کے مذہبی تصورات کے خلاف ہے۔ مذہبی رویہ کیا ہے؟ چند نتائج فکر پر اصرار اور ان سے مختلف کسی تعبیر کو ماننے سے انکار۔ جب سیکولرسٹ یہی رویہ اپناتے ہیں تو سیکولرزم بھی ایک مذہب بن جاتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

پاکستان میں مذہبی طبقات کی انتہا پسندی سے تنگ آئے ہوئے بعض پرجوش نوجوان، مجھے خدشہ ہے کہ سیکولرزم اور سیکولرائزیشن کے فرق سے واقف نہیں۔ میرا تاثر ہے کہ وہ جو بیانیہ سیکولرزم کے نام سے پیش کر رہے ہیں، دراصل سیکولرائزیشن کا بیانیہ ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ سماج کو کسی ایک طبقے کا فکری یرغمال نہ بنایا جائے۔ معاشرے میں فکری آزادی ہو۔ لوگوں کو یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ اپنے لیے من پسند طرز زندگی کا انتخاب کریں۔ وہ جس طرح یہ نہیں چاہتے کہ کوئی مذہبی تعبیر ان پر بالجبر نافذ کی جائے، اسی طرح وہ اس کے بھی خلاف ہیں کہ کوئی غیر مذہبی یا سیکولر تعبیر بھی ان پر زبردستی نافذ ہو۔ مجھے خدشہ ہے کہ اگر اس بات کو سیکولرزم سے الگ کرتے ہوئے نہ سمجھا گیا تو نوجوان نسل ایک نئے فکری بحران میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ پہلے خدا کے نام پر ان کا استحصال ہوا، اب آزادی کے نام پر انھیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس خدشے کا سبب وہی خلط مبحث ہے جو اصطلاحوں کے باعث وجود میں آیا ہے۔ اصطلاحیں فلسفیانہ تعبیر رکھتی ہیں اور سماجی بھی۔ سماجی مفاہیم لغت کی کتابوں سے نہیں، انسانی رویوں سے طے ہوتے ہیں۔ پاکستانی سماج اگر آزادی فکر کے کسی عمل سے گزرتا ہے جسے کوکس یا نور خالص مجید (liberating development) یا سیکولرائزیشن سے تعبیر کرتے ہیں تو یہ عمل ہمارے مذہبی اور تاریخی پس منظر کا پابند ہوگا۔ یہ پس منظر اس عمل کو جو مفہوم دے گا، وہ مقامی ہوگا۔ مصر اور انڈونیشیا جیسے ممالک میں یہ عمل کئی عشروں سے جاری ہے۔ ہمارے ہاں اب شروع ہوا ہے۔ اس

کا سبب شاید یہ ہے کہ وہ معاشرے ان تجربات سے برسوں پہلے گزر چکے جن سے ہم آج دو چار ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا دانش ور قدرے تاخیر سے بیدار ہوا ہے۔

خوش آیند یہ ہے کہ اس بحث کا آغاز ہو چکا۔ اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ میں آزادی فکر وعمل کا حامی ہوں۔ میرے نزدیک یہ اس الہامی منصوبے کا ناگزیر تقاضا ہے جو قانون آزمایش کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے۔ اس پر قید لگانا، دراصل وہ کام اپنے ہاتھ میں لینا ہے، جو خدا نے قدرت رکھتے ہوئے بھی، اپنے لیے پسند نہیں کیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مولانا امین احسن اصلاحی

# اسلامی ریاست میں عہدے کی طلب

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سوال: ایک مصنف لکھتے ہیں:

''اسلامی حکومت کے امتیازی اصولوں میں سے ایک یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جو شخص کسی حکومتی عہدے کا طالب یا خواہش مند ہو، اس کو عہدے کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری راوی ہیں کہ میرے خاندان کے دو آدمیوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی حکومتی عہدے کے لیے درخواست کی، تو آپ نے فرمایا: 'إنا واللّٰه لا نولی علٰی هٰذا العمل أحدًا سأله وَلا أحدًا حرص علیه'، ''خدا کی قسم، ہم کسی ایسے آدمی کو کوئی حکومتی عہدہ سپرد نہیں کرتے جو اس کے لیے خود طالب اور حریص ہو۔''

(رواہ بخاری و مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس صریح حکم کے بعد مصنف حکمت عملی کے حق میں استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''عام اصول تو یہی ہے لیکن اگر کوئی مخلص بندہ کسی خاص موقع پر یہ محسوس کرے کہ اس اہم خدمت کو اللہ کی توفیق سے میں اچھی طرح انجام دے سکتا ہوں تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے کو پیش کر دے اور حکومت کے ذمہ دار لوگ مطمئن ہوں تو وہ خدمت اس کے سپرد کر سکتے ہیں۔''

براہ کرم ان نتائج فکر کے متعلق اپنی راے ظاہر فرمائیے۔

جواب: اسلامی حکومت میں کسی مسلمان کے لیے کسی عہدے کی طلب اور تمنا اس اعتبار سے ایک ناپسندیدہ بات

ہے کہ اسلام میں ہر عہدہ کے ساتھ بہت سی اخروی ذمہ داریاں وابستہ ہیں۔ اگر ایک مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے کسی ذمہ داری سے بری رکھا ہے تو اس کی عاقبت بینی اور خداترسی کا تقاضا یہی ہونا چاہیے کہ وہ ازخود اس ذمہ داری کے لیے طالب اور متمنی نہ بنے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر کسی نے کسی منصب اور عہدہ کے لیے خواہش کر دی تو اس کی یہ خواہش اس کے اس منصب کے لیے اس کی نااہلیت (DISQUALIFICATION) کی کوئی مستقل دلیل بن گئی۔

اسلام میں جس طرح مناصب اور عہدوں کی طلب وتمنا ایک ناپسندیدہ بات ہے، اسی طرح ذمہ داریوں سے گریز وفرار بھی ایک ناپسندیدہ امر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک مرتبہ جب لوگوں کے اندر سرکاری ذمہ داریوں سے گریز کا رجحان بہت زیادہ بڑھ گیا تو انھوں نے اپنے ایک خطبہ میں لوگوں کو بڑی سختی سے ڈانٹا کہ اگر آپ لوگ حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے سے اسی طرح گریز کرتے رہے تو میں حکومت چلانے کے لیے آدمی کہاں سے لاؤں گا۔

ان دونوں حقیقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس معاملے میں صحیح اسلامی نقطۂ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کے لیے یہ بات تو ناپسندیدہ ہے کہ وہ کسی عہدہ کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ کرے، لیکن اگر کوئی ذمہ داری اس پر ڈال دی جائے تو اپنے اندر اس کی صلاحیت پاتے ہوئے اس سے گریز نہ کرے۔ بعض مواقع ایسے بھی پیش آسکتے ہیں، جبکہ وہ خود یا دوسرے ذی فہم لوگ یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہی اس کا اہل ہے کہ اس ذمہ داری کو سنبھالے، ورنہ کام خراب ہو جائے گا، جس سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔ ایسے حالات میں اس کا فرض ہے کہ وہ خود بڑھ کر اس ذمہ داری کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اندیشہ ہے کہ اس سے خدا کے ہاں اس بات پر مواخذہ ہو جائے کہ اس نے ایک ذمہ داری سے صلاحیت رکھتے ہوئے گریز کیا جس سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس مقصد کے لیے اس قسم کے مصنوعی طریقے اور لاحاصل بہانے نہیں پیدا کرنے چاہییں جس قسم کے طریقے اور بہانے اس زمانے میں وہ لوگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو شریعت کے معاملے میں گندم نمائی اور جَو فروشی کا کاروبار کر رہے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ایک اسلامی حکومت میں عہدوں کی طلب وتمنا اور ان سے گریز معیوب وہاں ہے جہاں طمع کے امکانات غالب ہوں۔ جہاں طمع سے زیادہ خطرات ومشکلات کا امکان ہو وہاں تو ذی صلاحیت لوگوں کو خود بخود بڑھ چڑھ کر اپنی خدمات پیش کرنا مطلوب ہے۔ جب صحیح راہ طلب وتمنا اور گریز وفرار، دونوں کے درمیان

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہوئی اور یہی اسلام کی اصلی راہ ہے تو یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ ان میں سے کوئی ایک چیز حرام ہونے کے باوجود اس لیے جائز ہوگئی ہے کہ یہ حکمت عملی کا تقاضا تھا۔

(تفہیم دین ۱۴۷)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

ہر لب پہ ہے غیروں کی عداوت کی کہانی    اس عہد کو سمجھے ہیں اعالی نہ ادانی

یہ علم کی آفت ہے، خدا اِس سے بچائے    ہر دور کے ملاؤں کا زعم ہمہ دانی

رہتی ہے کہاں اُس سے مروت کی توقع    مر جاتا ہے انسان کی جب آنکھ کا پانی

سینے سے لگا رکھتے تھے پہلے جسے برسوں    اب ہوتی ہے دو دن میں وہی چیز پرانی

اے پیر فلک، کہتی ہے کس غم کا فسانہ    ہر رات یہ عالم پہ تری اشک فشانی

کہتے ہیں کہ ہر گھر میں ہے عورت کی حکومت    یہ بات مگر سنتے ہیں مردوں کی زبانی

لے جاتی ہے صحراؤں میں کچھ شہر کی وحشت    کچھ ہوتی ہے شاعر کی طبیعت خفقانی

یہ فلسفہ ابلیس کا الہام ہے گویا    الفاظ سے مافوق بھی ہوتے ہیں معانی

ہر گام پہ آتے ہوں اگر راہ میں پتھر    بڑھ جاتی ہے کچھ اور بھی دریا کی روانی

وہ پہلے پہل جس کو تخیل نے تراشا    ڈھونڈو گے کہاں اُس بت گلفام کا ثانی

اے کاش، تجھے پردۂ تصویر پہ لائے    آنکھوں سے اٹھا کر کوئی بہزاد یا مانی

سچ یہ ہے کہ خود ہم نے بنا لی ہے جو اپنی    آساں نہیں خود ہم کو وہ تصویر دکھانی

مردہ ہے طبیعت تو جوانی بھی ہے پیری    دل پہلو میں زندہ ہے تو پیری بھی جوانی

مذہب کو کوئی اُس کی حقیقت میں دکھا دے　　کہتے ہیں: یہ ہے اور ہی اسلام کا بانی
مہر و مہ و انجم ہوں کہ ہستی کے کرشمے　　جس شے کو بھی دیکھیں، ہے وہی تیری نشانی
تو ظاہر و باطن ہے، تو ہی اول و آخر　　کیا سمجھیں گے تجھ کو یہ زمانی و مکانی

کہہ لیتے تھے اپنا بھی کوئی درد کسی سے
اب ہوتی ہے اِس سے بھی طبیعت کی گرانی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com